نمود

شمارہ ۱۲، ۲۰۲۳ء

طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

مدیر: زاہد حسن

نائب مدیران: فاطمۃ الزہرا، محمد ذوہیب احمد

مرکزِ زبان و ادب

LUMS | Gurmani Centre for Languages and Literature

فہرست

اداریہ	زاہد حسن		۵

اردو

مضامین

غلام عباس کے افسانہ ''دھنک'': ردِّ استعماری تناظر میں	اُشنا حامد	(طالبہ لمز)	۸
مجید امجد کی نظم ''کنواں'' کا فکری و فنی مطالعہ	لاریب فاطمہ	(طالبہ لمز)	۱۴
ن۔م۔راشد کی نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو'' کا فکری و فنی جائزہ	زرتاشیہ خان	(طالبہ لمز)	۲۰
میراجی کی نظم ''بیوپاری'' کا موضوعاتی و اسلوبیاتی تجزیہ	محمد صنان	(طالب علم لمز)	۲۶
وہ جو کھوئے گئے (انتظار حسین): شناخت کے بحران کا بیانیہ	فاطمہ سعید	(طالبہ لمز)	۳۰

افسانے / کہانیاں

ریٹرن ٹکٹ	اقرا انور	(طالبہ لمز)	۳۵
دوسری شرط	علی منظور	(طالب علم لمز)	۴۱
زیست	مہدیہ چیمہ	(طالبہ لمز)	۴۷
کچھ وقت	محمد عمر جمیل	(طالب علم لمز)	۵۱
کالے بِلّے	شعبان احمد	(طالب علم لمز)	۵۸
ماں کی محبت	محمد ہریرہ	(طالب علم لمز)	۶۲
حکایاتِ سعدی کی افادیت (مکالمہ)	فاطمۃ الزہرا	(طالبہ لمز)	۶۴

پنجابی

مضامین

امرتا پریتم دیاں کہانیاں تے شاعری دا فکری و فنی جائزہ	طاہر سحیل فاروق	(طالب علم لمز)	۶۸

ترجمہ

ہیر دے کجھ قصّے	راحم مظہر	(طالب علم لمز)	۷۴

ڈائری نویسی

ڈائری	خدیجہ ارشد	(طالبہ لمز)	۷۶
ڈائری	عائزہ شجاع	(طالبہ لمز)	۸۲

فارسی

خط‌های نوشتاری قدیمی از تاریخِ ایران	زمرن ڈیوڈ	(طالب علم لمز)	۸۷
سعدی کی نظم 'بنی آدم' کا تفصیلی مطالعہ	اقصیٰ مشرف	(طالبہ لمز)	۹۰
عشقِ مادر	محمد ہریرہ	(طالب علم لمز)	۹۳

پشتو

د ډاکټر طارق محمود دانش 'فن او شخصیت'	شاہ محمود خان	(طالب علم لمز)	۹۶
ډاکټر اباسین یوسفزے	منال امین	(طالب علم لمز)	۱۰۳

بلوچی

شاہ آباد	عبدالحلیم عالم	(طالب علم لمز)	۱۰۹

سندھی

بیت	ندیم	(طالب علم لمز)	۱۱۲
وتایو فقیر	لائبہ فاطمہ	(طالبہ لمز)	۱۱۳

اداریہ

نمود اس علمی، ادبی، شعری اور فکری روایت کا تسلسل ہے جو پچھلے بارہ برس سے جاری و ساری ہے۔ لمز کے طلبا و طالبات کی تخلیقی نگارشات پر مشتمل یہ جریدہ ہمیں ان رجحانات سے باخبر رکھتا ہے کہ معاصر ادبی منظر نامے میں ہمارے طلبا و طالبات کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعے کی دل چسپی کا دائرہ کار کیا ہے، وہ کن رویّوں سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے اظہار کے لیے کون سا پیرائہ منتخب کرتے ہیں۔ شروع میں نمود میں تخلیقات اردو زبان میں شائع ہوتی رہی ہیں، تاہم پچھلے تین برسوں سے اس میں پاکستان کی قومی زبانوں میں لکھا جانے والا ادب بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ گرمانی مرکزِ زبان و ادب میں چوں کہ اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم سب یہ جان سکیں کہ ان زبانوں کو پڑھنے والے طلبا و طالبات ان زبانوں میں اظہار کی قدرت کس قدر رکھتے ہیں۔ نیز وہ ان زبانوں میں کس طرح کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔

طلبا و طالبات کی ان نگارشات سے جو نثری اور شعری ہر دو اصناف میں شاملِ اشاعت ہیں، ہم یہ اندازہ بہ خوبی لگا سکتے ہیں کہ نئی نسل نہ صرف اپنی روایات اور کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ رکھتی ہے بلکہ اشیا اور زمانے کو پرکھنے کے حوالے سے بھی ان کا مشاہدہ خوب ہے۔ اور وہ اظہار کی صلاحیت بھی بہت عمدہ رکھتے ہیں۔ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو میں شامل تحریریں ان کے اپنی ثقافت، زبان اور لوگوں سے جُڑے ہونے کی گواہی دیتی ہیں، اسی طرح اردو اور فارسی میں شامل ادب اس امر کا احساس دلاتا ہے کہ ادب و شعر کبھی بھی جغرافیائی حد

بندیوں کا پابند نہیں رہا۔ امن، رواداری اور محبت جو دنیا بھر کے انسانوں کا سانجھا اور مشترکہ ورثہ ہے، اس کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنانا اور دنیا میں اسے رواج دینا، نسلِ انسانی کا پُرانا خواب ہے۔

اس شمارے میں شامل تخلیقات کے سلسلے میں ہم اشوک کمار، جہانزیب بلوچ، عماد خان، افتخار وزیر، ضیاالحسن، اور ناصر عباس نیّر کے بھی ممنون ہیں کہ طلبا و طالبات کی تخلیقات کو بہم پہنچانے میں اور سنوارنے میں ان کا تعاون بھی شاملِ حال رہا۔

نمود کی تزئین و آرائش کا کام فرحان سلیم نے احسن طور پر سرانجام دیا ان کا شکریہ، اور ان تمام طلبا کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی نگارشات کے ذریعے اس رسالے کی افادیت بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

مدیران

اردو

نمود، شمارہ ۱۲، ۲۰۲۳ء

اُشنا حامد

غلام عباس کا افسانہ ''دھنک'': ردِّ استعماری تناظر

غلام عباس اُردو کے بہت مشہور اور اہم مصنف ہیں۔ اُن کے بہت سے افسانے کافی مشہور و مقبول ہوئے۔ اُن کی تحریروں میں مضمون کی وحدت ہوتی تھی۔ وہ بہت سادہ لکھتے تھے اور اُن کا لکھنے کا انداز ہی ان کا بنیادی اثاثہ تھا۔ انھوں نے کافی عمر کے بعد افسانے لکھنے شروع کیے۔ وہ داستانوں میں بھی بہت شوق رکھتے تھے، داستانِ امیر حمزہ ان کی پسندیدہ داستان تھی۔ انسانی فریب خوردگی اُن کے افسانوں کا ایک اہم موضوع ہے جو اُن کے اس افسانے ''دھنک'' میں بھی پائی جاتی ہے۔

دھنک۔ اہم واقعات

اس افسانے کے شروع میں سب لوگ، اہم افسران اور دوسرے ممالک کے سفیر ہوٹل موہنجو داڑو میں جمع ہو کر پاکستان کے ایک آدمی کا چاند پر پہنچنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ ریڈیو پر سب سنتے ہیں کہ آدم خان جو ضلع جھنگ سے تعلق رکھنے والے ہیں چاند پر پہنچنے والے ہیں۔ لائیو ٹرانسمشن کے ذریعے سب اُن کے پہنچنے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ آدم خان کی آواز ریڈیو پر آتی ہے اور وہ اپنے چاند پر پہنچنے کا اعلان کرتے ہیں۔ سب اِس بات کی حکومت کو مبارک باد دیتے ہیں۔ دور کراچی میں ریڈیو پر یہ خبر سنتے ہوئے مولوی اس پر سخت طیش میں ہوتے ہیں۔ اور جگہ بھی مُلّا غضب ڈھا رہے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ انسان کو خدا نے زمین پر بھیجا ہے اور وہ اتنا ناشُکرا ہے کہ اپنے گناہوں کے لیے زمین کی وسعتیں اِس پر تنگ پڑ گئی ہیں۔ یہ سراسر کفر ہے۔ وہ اس پر بہت جلوس نکالتے ہیں اور فسادات برپا کرتے ہیں مگر حکومت اِس پر زیادہ کان نہیں دھرتی، وہ سوچتے ہیں کہ

ملاؤں کا تو کام ہی یہی ہے کچھ عرصہ بولیں گے پھر خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ مگر یہ بات دبتی نہیں ہے۔ مُلّا حضرات عوام کو منا لیتے ہیں کہ یہ حکومت ہم سے کفر کروا رہی ہے اور انقلاب لانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔ وہ حکومت گرا کر اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں اور ایک امیر لے آتے ہیں ساتھ ساتھ اِسلامی نظام رائج کر لیتے ہیں۔ بہت سے فرقے آپس میں مِل جُل کر کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک سال کے بعد فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔ اِن دنگے فسادوں میں عوام کا نقصان ہونے لگتا ہے۔ ہر فرقہ ایک دوسرے سے دُشمنی کرنے کے لیے دوسرے کے بندے قتل کرنے لگتا ہے۔ ایک فرقے کے امیر جب وفات پاتے ہیں تو ملک بھر میں تمام فرقے آپس میں لڑائیوں میں لگ جاتے ہیں۔ اور پُورا ملک برباد ہو جاتا ہے۔ بہت عرصے بعد وہاں پر باہر کے لوگ گھومنے آتے ہیں تو ہوٹل موہنجوداڑو کو خراب اور ویران حالت میں دیکھتے ہیں اُن کا ٹور گائیڈ اُنھیں بتاتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سب رنگوں کی شروعات ہوئی کیوں کہ یہاں سے ہی آدمی چاند پر گیا تھا اور اُس کی تقریب ہوئی تھی۔

اِس افسانے کے واقعات کی رُو سے کچھ اہم نکات درج ذیل ہیں:

- روشن خیالی
- ملک کی مذہبی بنیادیں
- مذہبی انقلاب
- جدیدیت کا خوف
- فرقہ وارانہ فسادات

روشن خیالی

مغرب میں جب روشن خیالی آئی تو یہ وہ وقت تھا جب وہاں کے لوگوں نے اپنی سوچ کو مذہب سے جدا

کرنے کی ٹھانی۔ اُنھوں نے اپنے تمام کاموں کو چرچ سے الگ کیا اور ہر چیز کی جڑ سے اِس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے یعنی مسلمانوں نے اپنے چرچ یعنی مذہب کو کبھی جدا نہیں کیا اور صرف اِسی کی رُو سے سوچا اور دنیا کو دیکھا۔ اس افسانے میں مذہب کی ہمارے تمام معاملات میں عمل دخل کی صاف دلیلیں پائی جاتی ہیں۔ جو اِن حالات اور واقعات کے نقشے کے ذریعے دیکھی جاسکتی ہیں۔

"اللہ کا بڑا فضل ہے"

۱۹۴۸ء میں منٹو نے اپنے مشہور افسانے "اللہ کا بڑا فضل ہے" میں وہ واقعات بیان کیے جو ایک ایسی ریاست کے ہوسکتے ہیں جو اسلام کا عمل دخل اپنے معاملات میں کم نہیں کرے گی۔ اُنھوں نے پاکستان کے مستقبل کی تصویر کھینچی اور اِسی تصویر سے متاثر ہو کر غلام عباس نے یہ افسانہ لکھا۔ جن واقعات کی طرف منٹو نے کئی سال پہلے اشارہ کیا تھا اِنھی کی ایک تصویر اس افسانے میں غلام عباس بنا رہے ہیں پاکستان بننے کے کچھ سال بعد۔

مابعد نو آبادیات اور ردِّ استعمار کاری تناظر:

اس سے پہلے کے مابعد نو آبادیات کے مزید پہلو بیان کیے جائیں، ردِّ استعمار کاری کو مختصراً وضاحت کرتے ہیں۔ ردِّ استعماری جیسے کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ استعماری کے تناظر کو رد کرنے کا خیال ہے۔ انگریزی میں اس کو decoloniality بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اِس idea کی خلاف ورزی اور ایک کوشش ہے کہ استعماریت کے تناظر سے اور اِس کے اثرات سے چھٹکارا پایا جائے۔ ایسی کوشش ہمارے ادب میں بہت ضروری ہے اور بہت کم کی گئی ہے۔ ہم اب تک استعماریت سے اور نو آبادیات کے اثرات سے دوچار ہیں۔ اس تناظر میں اس افسانے کے کئی اہم پہلو ہیں۔

ملک کی مذہبی بنیادیں:

اس افسانے میں سب سے بڑی تنقید ان بنیادوں پر کی گئی ہے جن پر اس ملک کو بنایا گیا۔ پاکستان کو

مذہبی بنا پر ہندوؤں سے الگ کیا گیا۔ اِسی بنیاد پر اِن کی سپورٹ حاصل کی گئی اور مسلمانوں سے ایک الگ مملکت کا وعدہ کیا گیا۔ جہاں صرف مسلمان رہیں گے اور اپنی زندگی اسلام کے اُصولوں کے مطابق بسر کریں گے۔ یہ وہ بنیاد تھی جو extremism کو جنم دے سکتی ہے جیسا کہ اِس نے کیا۔ قائدِ اعظم کو یہ بات پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد ہی سمجھ آگئی تھی مگر اب اِس کے بارے میں کچھ کیا نہیں جاسکتا تھا۔ جو ملک اور گروہ مذہب کی بنیاد پر بنتے ہیں ان میں انتشار کا خطرہ بھی رہتا ہے۔ جب تک اسلامی بنیادیں رہیں گی انقلاب کسی بھی وقت آسکتا ہے۔

اِسلامی انقلاب:

اس افسانے میں بھی مُلّا حضرات طیش میں آکے جو اِنقلاب لاتے ہیں اس کی بنیادیں مذہبی ہوتی ہیں۔ سکول کالج بند کروائے جاتے ہیں، سینما گھروں کی جگہ مذہبی درسگاہیں بنائی جاتی ہیں، نماز روزے کی پابندی اور عورتوں کے گھروں سے نکلنے کی پابندی اور اُن کی تعلیم پر بھی پابندی لگادی جاتی ہے۔ اِسی طرح کے اور بھی بہت سے سنگین اقدامات کیے جاتے ہیں جو اِسلام کی رُو سے اُن کو ٹھیک لگتے ہیں جیسے کہ اِسلامی سزائیں سب جرائم کے لیے رائج کر دی جاتی ہیں۔ ایک ملک میں سب لوگ ایک طرح کے نہیں رہتے ہیں اور لوگوں کو اِس بات کا حق دینا بہت ضروری ہے کہ وہ آزادی سے اپنی زندگی بسر کریں۔ اور اِسی طرح رہیں کہ جیسے اُن کا جی چاہے۔ مذہبی انقلاب اسی وجہ سے کبھی کامیاب نہیں ہوتے مثلاً ایران کا انقلاب بھی جو مذہبی (اسلامی) بنیاد پر لایا گیا تھا کیوں کہ یہ اپنے ساتھ ایک آئیڈیل لاتے ہیں جس کا حصول بہت مشکل ہوتا ہے۔ اِسی وجہ سے مذہبی انقلاب آنے سے تباہی و بربادی کے سِوا کچھ نہیں ملتا اور کسی کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

جدیدیت کا خوف:

ایک اور پہلو جو اِس افسانے میں دیکھا جاسکتا ہے اور جس پر غلام عباس تنقید کر رہے ہیں وہ ہے ہمارے ملاؤں اور عوام کا جدیدیت سے خوف۔ ایک جگہ ایک حکومتی رکن بیان کرتے ہیں کہ جانے اِن ملاؤں کو کس

بات کا مسئلہ ہے جس پر یہ تنقید کر رہے ہیں اس کا تو خود اللہ نے حکم دیا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

"یہ کائنات تمہارے لیے ہے تم اِسے مسخر کرو۔"

مگر یہ مُلّا حضرات چاند پر جانے کو گناہ کا نام دے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو چیزیں خدا نے ہم سے دُور رکھی ہیں اُن کے بارے میں جاننے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے اور اِنسان خدا کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اِنھوں نے صرف چاند کی رسائی کے پیچھے پُورا ملک برباد کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی maternity سے خوف کھاتے ہیں۔ ایک اور حکومتی رُکن افسانے میں کہتے ہیں کہ اِن ملاؤں کو تو لاؤڈ اسپیکر کی ایجاد اور استعمال سے بھی مسئلہ ہے کچھ عرصہ بولیں گے پھر بھول جائیں گے۔ انقلاب آتے ہی اِنہوں نے سب سے پہلے حکم دیا کہ جدید طرز کے تمام آلات اور technology کو اب ترک کر دیا جائے۔ وہ اپنے ساتھ ایک ریاستِ مدینہ کا خیال لے کر آئے تھے جو ایک عملی خیال نہیں ہے۔ جدید دور ہے اس لیے وقت بدلے گا اور مسلمانوں کو اِس کے ساتھ بدلنا ہو گا۔ مگر وہ ملا حضرات اور بہت سے انقلاب کی پیروی کرنے والے جدیدیت کو مغرب کے ساتھ یکساں تصّور کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ modernity کسی ایک تہذیب کی ملکیت ہو یا اِسی نے حاصل کی ہو مگر چوں کہ انھوں نے پہلے ہی enlightenment کے دور میں یہ کر لیا تو مسلمانوں میں ایک خوف ہے کہ جدید کام کرنا، دین سے دوری کا ذریعہ بن سکتا ہے یا اِسی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات:

ایک اہم پہلو جس پر ردِّ استعماری کی روشنی میں غلام عباس تنقید کر رہے ہیں وہ فرقے ہیں جو مذہب کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں اِس افسانے میں بھی وہ نیلی پوش، پیلی پوش، سیاہ پوش، سرخ پوش اور سبز پوش فرقوں کے ذریعے بتا رہے ہیں مذہب کی بنیاد پر ملک نہیں چل سکتا کیوں کہ پھر بہت سے فرقے اپنے حساب سے اِس کو چلانے کی کوشش کریں گے اور اِس سے بہت انتشار پھیل سکتا ہے سو یہ صحیح راستہ نہیں۔ یہ سب فرقے جتنا بھی مِل کر

ملک کو چلانے اور ایک دھنک بنانے کی بات کریں اِن کے بنیادی نظریے الگ الگ ہیں اور اُنھی نظریوں کی وجہ سے افسانے میں بھی ملک میں طویل فسادات اور پھر ملک کا خاتمہ ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ استعماریت پر استوار اس مذہب کی لکیروں سے نکل کر اب وقت ہے کہ صحیح طریقوں سے ملک چلایا جائے۔ اس سے پہلے کہ اس طرح کا کوئی فساد برپا ہو۔ یہ ایک طرح سے ایک warning ہے یا پھر foresight وہ اپنا خیال بیان کر کے تاکید کر رہے ہیں کہ colonial masters نے جن مذہب کی لکیروں سے ہمیں گھیر کر ہندو مسلمان کی تفریق پیدا کی ہے۔ اب اس کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے اور یہی انجام ہو جو افسانے میں ملک کا ہوا۔

❋ ❋ ❋

لاریب فاطمہ

مجید امجد کی نظم "کنواں" کا فکری و فنی مطالعہ

نظم

کنواں چل رہا ہے، مگر کھیت سوکھے پڑے ہیں، نہ فصلیں، نہ خرمن، نہ دانہ
نہ شاخوں کی باہیں، نہ پھولوں کے مکھڑے، نہ کلیوں کے ماتھے، نہ رُت کی جوانی
گُزرتا ہے کیاروں کے پیاسے کناروں کو یوں چیر تا تیز، خوں رنگ پانی
کہ جس طرح زخموں کی دکھتی ٹپکتی تہوں میں کسی نیشتر کی روانی
ادھر دھیری دھیری
کنوئیں کی نفیری
ہے چھیڑے چلی جا رہی اک ترانہ
پُراسرار گانا
جسے سُن کے رقصاں ہے اندھے تھکے ہارے بے جان بیلوں کا جوڑا بچارا
گراں بار زنجیریں، بھاری سلاسل، کڑکتے ہوئے آتشیں تازیانے
طویل اور لامنتہی راستے پر بچھا رکھے ہیں دام اپنے قضا نے
اِدھر وہ مصیبت کے ساتھی ملائے ہوئے سینگوں سے سینگ، شانوں سے شانے
رواں ہیں نہ جانے
کدھر؟ کس ٹھکانے؟

نہ رُکنے کی تاب اور نہ چلنے کا یارا

مُقدر نیارا

کنوئیں والا گادی پہ لیٹا ہے مست اپنی بنسی کی میٹھی سُریلی صدا میں

کہیں کھیت سوکھا پڑا رہ گیا اور نہ اس تک کبھی آئی پانی کی باری

کہیں بہہ گئی ایک ہی تُند ریلے کی فیاض لہروں میں کیاری کی کیاری

کہیں ہو گئیں دھول میں دھول لاکھوں رنگا رنگ فصلیں، ثمر دار ساری

پریشاں پریشاں

گریزاں گریزاں

تڑپتی ہیں خوشبوئیں دامِ ہوا میں

نظامِ فنا میں

اور اک نغمۂ سرمدی کان میں آ رہا ہے، مسلسل کنواں چل رہا ہے

پیاپے مگر نرم رو اس کی رفتار، پیہم مگر بے تکان اس کی گردش

عدم سے ازل تک، ازل سے ابد تک، بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش

نہ جانے لئے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش

رواں ہے رواں ہے

تپاں ہے تپاں ہے

یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے

کنواں چل رہا ہے

نظم کا فکری و فنی مطالعہ

لفظ ''کنواں'' سُنتے ہی یقیناً قارئین کے دل میں کئی خیالات اجاگر ہوتے ہیں، کئی صورتیں، کئی رجحانات، کئی آوازیں ان کے جہانِ قلب کو گرما دیتی ہیں۔ بس یہ نظم قارئین کے انہی تاثراتِ قلب کا مرکب ہے۔ گویا یہ نظم شاعر سے زیادہ قاری کے ذہن کا ثمر ہو گا کیوں کہ یہ ایک استعاراتی و تصویری نظم ہے۔

مجید امجد ''کنواں'' کے شاعر 'ادب برائے ادب' کی تحریک کے ستونوں میں سے ایک تھے۔ آپ نے کئی تجربے کیے مگر آپ کا سب سے کامیاب تجربہ آزاد نظم کا تھا جس کی سب سے نمایاں خصوصیت میرے مطابق ان کا تصوّرِ وقت تھا۔ وہی ان کی شاعری کو سب سے ممتاز بناتا ہے۔ اگرچہ یہ مہارت کڑی ریاضت کے بعد شاعروں کے حصے آتی ہے مگر میرے خیال میں مجید امجد کے حصے میں آنے والی یہ خوبی ممتاز آمد کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قدرتی مہارت اس کلام کے لیے شرط ہے کیوں کہ آپ کی تمام نظموں میں وقت کا ایسا تصوّر پیش کیا گیا ہے جو زمان و مکاں میں قید بھی ہے اور یک سر آزاد بھی، گویا آپ ماضی کی تابناکی یا مستقبل کے خوف یا اُمید سے مکمل آزاد ہو کر وقت کے ایک خاص دہانے سے گُزر کر پیش کرتے ہیں جہاں وہ ایک تماشائی ہے اور آپ کی نظم اردو شاعری کے موضوعات میں ایک نیا 'جہان'۔

جب وہ وقت کے ایک خاص دہانے پر جا کھڑے ہوتے ہیں تو ایک منظر نظر آتا ہے۔ بس اسی منظر کو اصوات و الفاظ کی شکل دینا ان کا کمال ہے۔

نظم ''کنواں'' بھی ایک منظر کا بیاں ہے، گویا تصویر کشی کی اعلیٰ مثال۔ مجید امجد کی شاعری کی خوبی ہے کہ وہ جو دیکھتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں۔ آپ ماحول کے شاعر ہیں اور ارد گرد کے حالات و واقعات کے عکاس۔ آپ کی اپنے ارد گرد کی دنیا پر بڑی گہری نظر ہے یہی وجہ ہے کہ آپ نے اکثر نظروں سے اوجھل ہو جانے والے کنویں کو بھی معانی کے الگ سانچے سے پیش کیا ہے۔ یہی بات وہ اپنی نظم ''شاعری'' میں بھی کرتے ہیں کہ:

میں ہوں شاعر! میری جمالیں نگہ میں
ذرا بھی نہیں فرق ذرّے میں تہ میں

نیز یہ کہ آپ فطرت کے شاعر بھی ہیں، یہی منظر ہمیں اس نظم میں نظر آتا ہے کہ آپ نے کھیت، فصلوں، آب اور قدرتی مناظر کو پیش کیا ہے۔ جس میں آپ کی direction اور کثیر لسانی مہارت بھی جھلکتی ہے۔

نظم ''کنواں'' میں کئی کردار ہیں۔ کنواں، بیل، بیلوں کو چلانے والا، کھیت اور اس کہانی کو پیش کرنے والا شاعر۔ عمومی طور پر موضوع کا بیان تو یوں ہے کہ کنواں مریل بیلوں کا ایک جوڑا چلا رہا ہے۔ مگر مالک کو کوئی فکر نہیں کہ کھیت سیر اب ہوتا ہے یا نہیں، اور کچھ فصلیں بہہ جاتی ہیں اور کچھ سُوکھی رہ جاتی ہیں۔

نظم ''کنواں'' میں کنویں کا استعارہ قارئین کے مطابق کئی معانی رکھ سکتا ہے۔ بعض کے مطابق یہ کنواں ''وقت کے چکر کا آئینہ دار'' ہے اور بعض کے مطابق ''زندگی'' کا۔ جبکہ کچھ کہیں گے کہ یہ ''سرمایہ داری نظام'' میں پسی دنیا کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔ جب کہ میرے مطابق تو یہ خدا سے ان تمام معانی کے اثرات اور وجوہات کے سلسلے میں شکایت ہے۔

شکوہ اللہ سے، خاکم بدہن، ہے مجھ کو

آپ نے لفظوں کی بہترین ترکیب اور تکرارِ تراکیب سے ایک موسیقیت پیدا کی ہے۔ شاعر ایک طرح شکر کرتا ہے کہ کنواں تو چل رہا ہے یہ دنیا یوں ہی رواں دواں ہے مگر ہر طرف ایک سوکھے کھیت کا منظر ہے۔ ہر طرف تباہی ہے، نہ پھول کھلے ہیں، نہ بہار آئی ہے، بس بہار کا انتظار ہے جس کی خاطر کب سے آس لگائے گندم کے خوشوں کے ناموجود کنارے حلق میں نشتر چبھائے بیٹھے ہیں۔

گویا کنواں نہیں بلکہ غموں کی ایک دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں مگر کوئی

مستقل مقصدِ زندگی نہیں۔ کیا یہ دنیا بھی شاعری ہے، جس میں ابہام ضروری تھا۔ نظم کے مصرعے پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا آپ کنویں کو چلتے ہوئے سُن سکتے ہیں۔

سو انسان کی رگوں میں ہر دم خون دوڑتا رہتا ہے۔ سینہ دُکھوں سے چھلنی رہتا ہے۔ زندگی ایک نغمہ چھیڑے جاتی ہے جو خون کی گردش کو گرماتی ہے لیکن دکھوں کا درمان نہیں بنتا۔

سو یہ دنیا، یہ بے ربط سی ایک زنجیر
یہ دنیا نہیں میرے خوابوں کی تعبیر

''بیلوں کا جوڑا'' یا تو انسان اور اس کی اُمیدوں اور حرکت کا مرکز ہے یا معانی کا۔ دوسرے منظر کے مطابق اسے سرمایہ داری کے نظام میں پستے لوگوں کی روداد قرار دیا جاسکتا ہے۔

انسان ایک بیل کی مانند زندگی کے اس کنویں کو متحرک رکھتا ہے، اس امید پر کہ شاید مقصد کا کنارا مل جائے۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ خدا نے بڑی چالاکی کے ساتھ انسان کو اس گول دائرے کی حرکت میں مصروف کر دیا ہے جس سے وہ نظامِ دنیا چلاتا رہتا ہے مگر انسان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کی حالت مزید ابتر ہوتی رہتی ہے۔ نہ اس کی امیدوں کی فصلوں پہ پھول کھلتے ہیں نہ حیات کی تکمیل ہوتی ہے۔

دنیا میں بھی ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ کہیں کسی کے گھر میں چولھا بھی نہیں جلتا اور کہیں کسی کے گھر میں دولت کی فراوانی ہے، سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا خدا کو اس بات کی فکر نہیں کہ وہ خالق کائنات ہے یا انصاف کی فراہمی اس کی ذمّہ داری ہے۔ اور یہاں انسان ہے کہ نہ مرنے کی ہمت اور نہ جینے کا حوصلہ، وہ ایک بے موت زندگی میں انتقال کر جاتا ہے۔

اگر میں خدا اس زمانے کا ہوتا
تو عنوان کچھ اور اس افسانے کا ہوتا

فطرت کے مناظر کے ساتھ ساتھ اس آزاد نظم میں آپ نے حزن و ملال کی بھی ایک کیفیت پیدا کی ہے۔ نارسائی اور دُکھ کی وہ کیفیت جو کائناتی بھی ہے اور ذاتی بھی۔ یہی آپ کی شاعری کے توازن کا بیان ہے کہ آپ نے شاعری میں وہ خط کھینچا ہے کہ جو اوّل تو مادی اشیا اور صورت (کنویں) کی جانب پرواز کرتا ہے مگر پھر وہ قلبی اثرات کی طرف رُخ کرتا ہے جہاں احساس اُس تصویر کو بھرپور کر دیتا ہے۔ گویا! بس یہ ہی ایک سلسلہ ازل سے ابد تک جاری ہے کہ کنویں والا (خدا) عرش (اپنی گاونی) پر مست ہے اور یہاں دنیا عجیب طرح سے کش مکش کا شکار ہے۔

دائم آباد رہے گی یہ دنیا
ہم نہ ہوں گے، کوئی ہم سا ہوگا

❁❁❁

زرتاشیہ خان

ن۔م۔راشد کی نظم ”زندگی سے ڈرتے ہو“: فکری و فنی جائزہ

نظم

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو زندگی تو ہم بھی ہیں!
زندگی سے ڈرتے ہو؟
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو آدمی تو ہم بھی ہیں
آدمی زباں بھی ہے آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
”ان کہی“ سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو
پہلے بھی تو گزرے ہیں

دور نارسائی کے "بے ریا" خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو ہیچ آرزومندی
یہ شب زباں بندی ہے رہ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو
لب اگر نہیں ہلتے ہاتھ جاگ اُٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر خاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو

تم ابھی سے ڈرتے ہو؟
ہاں ابھی تو تم بھی ہو
ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں
تم ابھی سے ڈرتے ہو

فکری و فنی جائزہ

اس نظم میں ن۔ م۔ راشد نے زندگی اور اس کے بیشتر عناصر کو بیان کرتے ہوئے انسان کو مخاطب کر کے اُس سے اس کے خوف کا سوال کیا ہے۔ یہ آزاد نظم ہے جس میں قافیہ اور ردیف کا استعمال ہے اور ''ڈرتے ہو'' کا استعمال بہت زیادہ آیا ہے۔

شاعر نظم کے آغاز میں انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم زندگی سے کیوں ڈرتے ہو جب کہ تم اور میں دونوں ہی زندگی کا حصّہ ہیں۔ یعنی کہ اگر تم ہو تو تمھاری زندگی ہے۔ یہاں پر زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کس طرح کچھ لوگ زندگی میں اتنی تکالیف دیکھتے ہیں کہ جو زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے وہی ان پر ایک ہیبت ناک بوجھ بن جاتی ہے جس سے وہ ڈرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد شاعر دوبارہ انسان کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم انسان یعنی آدمی سے ڈرتے ہو۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو سب سے زیادہ خوف لوگوں کا یعنی دوسرے انسانوں کا ہوتا ہے اور اس کے اکثر اعمال اس بات پر انحصار کرتے ہیں۔

اس کے بعد شاعر آدمی کے زبان و بیاں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کے جو حرف اور ان کے معنی ہیں وہ آپس میں لوہے جتنا مضبوط تعلق رکھتے ہیں۔ اس بات کو اس زاویے سے دیکھا جائے تو یہ سمجھ آتا ہے

کہ کوئی بھی حرف معنی کے بغیر نہیں ہوتا۔ ایک کے ہونے کے لیے دوسرے کا ہونا بہت ضروری ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ انسان کی سب سے اہم چیز زبان و بیاں ہے جو ہر کام سنوار بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی، تو ہمیں تو اس سے ڈرنا چاہیے۔ پھر شاعر سوال کرتا ہے کہ تم اس سے نہیں ڈرتے؟ پھر شاعر آدمی اور زندگی کی وابستگی کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کے ہونے سے ہی زندگی ہے۔

اس کے بعد شاعر مستقبل کے خوف کا سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابھی جو وقت آیا نہیں اور ابھی جو بات ہوئی نہیں تم اس سے ڈرتے ہو۔ جب کہ تمھیں اس کی certainty کا علم بھی نہیں۔ یہاں شاعر انسانی نفسیات کا ایک بہت اہم خوف بیان کر رہے ہیں کہ ہر انسان کو مستقبل سے ڈر لگتا ہے، یعنی انسان جس چیز میں surety نہیں رکھتا اور doubt میں ہوتا ہے اس چیز سے انسان ڈرتا رہتا ہے۔

اس کے بعد شاعر انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ابھی تم مشکل میں ہو مگر ایسے وقت تو پہلے بھی آئے تھے، جب ظلم اور جبر تم پر مختلف آمریتوں کی صورت مسلط تھے، تو اب کیوں اس آمریت پر خاموشی سادھ لینے کو خدا کی راہ کہتے ہو۔ یعنی کہ شاعر انسان کو کہتا ہے کہ پہلے تو ظلم کے خلاف بولا کرتے تھے اب اس آمریت کو خدا کی راہ اور نصیب کا لکھا کہہ کر خاموش کیوں ہو۔

شاعر مزید کہتا ہے کہ جب لوگ ظلم و جبر برداشت کر کے بھی خاموش رہتے ہیں تو عملی کوشش جاری ہو جاتی ہے۔ تو پھر حق کی آواز بن کر لوگ عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس کے بعد صبح کی اذان کا ذکر ہے کہ کیسے صبح کی اذان باقی اذانوں سے مختلف ہے کہ وہ سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کی خاطر ایک اضافی سطر رکھتی ہے۔ اسی طرح جب لوگ خاموش رہتے ہیں تو عملی جدوجہد کی صورت میں لوگوں کو جگانے کی خاطر ایک تحریک چل پڑتی ہے۔

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ: اے انسان! تم روشنی سے کیوں ڈرتے ہو، جب کہ روشنی تو تم اور ہم

سب ہیں۔ یہاں روشنی سے مُراد علم بھی ہو سکتا ہے کہ کس طرح علم کی وسعتوں سے انسان ڈر جاتا ہے جب کہ علم کا وجود انسان ہی سے ہے۔

شاعر مزید کہتے ہیں کہ جو شہر کی حدود پر ایک ہیبت ناک دیو کا سایہ تھا وہ ٹل گیا ہے یعنی کہ جو شہر پر مصیبتیں تھیں وہ اب ختم ہو گئی ہیں۔ اس کے بعد شاعر نے زندگی کی مشکلات کو رات کے لبادے سے تشبیہ دی ہے کہ دن چڑھنے پر کس طرح اب وہ ختم ہو گئی ہیں۔

اس کے بعد شاعر کہتے ہیں کہ انسانوں کے گروہ سے ایک فرد کی صدا آئی۔ یہاں وہ unity کا ذکر کر رہے ہیں کہ کس طرح سب لوگ ایک فرد کی خاطر اس کے حق کے لیے بول رہے ہیں۔

پھر شاعر راہِ شوق کا ذکر کرتے ہیں کہ جو شوقین آدمی ہوتا ہے وہ اپنی منزل پانے کے لیے خون تک بہا دیتا ہے۔ یعنی اس کا جنون اس قدر سچا ہوتا ہے کہ وہ اس کو پُورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ یہاں شاعر اس انسان کا ذکر کرتا ہے جو پہلے ظلم کے خلاف خاموش تھا مگر اب وہ جدوجہد کر کے ایک نئے جنون سے سرشار ہو گیا ہے تو دیکھو کیسے سب مشکلات ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

شاعر آدمی بنسے اور شہر بسے کہہ کر یہ بتا رہے ہیں کہ عملی جدوجہد کے بعد اب آدمی کو دیکھو، خوشیوں میں لوٹ رہا ہے اور جو ڈرا سہما اور اُجڑا شہر تھا اب وہ دوبارہ سے بسنے لگا ہے۔

آخر میں شاعر آدمی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم ابھی جو وقت ہے اس سے ڈرتے ہو یعنی حال سے۔ جب کہ یہ کمی بھی تمھارے اور میرے ہونے کی وجہ سے ہی وجود رکھتی ہے۔

اس نظم میں ن۔م۔ راشد زندگی اور اس میں موجود خوف کا ذکر کرتے ہوئے انسان سے سوال کرتے ہیں اور اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انسان کو مختلف مثالیں دے کر جگانے کی کوشش کرتے ہیں اور اُسے عملی جدوجہد کا درس دیتے ہوئے اس کے فوائد سے بھی روشناس کرواتے ہیں۔ نظم کی ابتدا میں سوال کر

کے انسان کو آئینہ دکھانے کے بعد شاعر پھر انسان کی توجہ ایک اہم سبق کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ نظم زندگی کے مختلف لیکن بعض اہم موضوعات کی ترجمانی کرتے ہوئے بہت سی چیزوں پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے اور انسان کی خودی کو جگانے کی کوشش کرتی ہے۔

❋ ❋ ❋

محمد صنان

میراجی کی نظم "بیوپاری" کا موضوعاتی و اسلوبیاتی تجزیہ

نظم

جس پر بھی کوئی دُکھ بیتے مجھ کو آ کے سناتا ہے
بِپتا کی ہر راگنی میرے کان میں آ کر گاتا ہے
میں ہوں اِک بھنڈار دُکھوں کا میرے پاس خزانہ ہے
میں نے اَوروں کے دُکھ میں اپنے دُکھ کو پہچانا ہے
آؤ آؤ، سُکھ لائے ہو؟ بولو، مول بتاؤ تم
اپنے اپنے سُکھ کے بدلے مجھ سے دُکھ لے جاؤ تم
پَل دو پَل کا سُکھ لائے ہو؟ پَل دو پَل کا دُکھ بھی ہے!
جیسا دُکھ لینے آئے ہو، جیب میں ایسا سُکھ بھی ہے؟
نقد کی بات کیا کرتا ہوں، میرے پاس ادھار نہیں
تول میں کھوٹ ذرا آئے، تو سَودا پورم پار نہیں
قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھرُمٹ مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوس ریشم کے اور ان کی لرزش
یہ غازہ، یہ انجن
نسائی فسوں کی ہر اِک موہنی آج کرتی ہے سازش

مِرے دل کو بہکا رہی ہے
مِرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو

نظم کو موضوعاتی و اسلوبیاتی تجزیہ

میرا جی شاعری کے اندر ایک ایسا میلان تخلیق کرتے نظر آتے ہیں کہ جہاں معانی کی نئی جہتیں کھُلتی نظر آتی ہیں۔ انسان جب غاروں سے باہر نکلا اور شعور کی منازل تک رسائی حاصل کر لی تو اس نے بیوپار یعنی تجارت کا آغاز کیا۔ اس بیوپار کے ذریعے وہ دوسرے لوگوں سے ملا، ان سے ہم آہنگی پیدا کی۔ خیالات کا تبادلہ کیا اور ساتھ مل کر ایک جدّت پسندانہ زندگی کی بنیاد رکھی۔ سو بیوپار انسان کی روایت کا حصّہ ہے۔ اولاً انسان نے بیوپار میں Barter System کا اجرا کیا۔ یعنی ایک چیز کے ہم وزن دوسری چیز کے تبادلے کے نظام کو جاری کیا۔ معنوی طور پر بیوپار ایک معاشی عمل ہے مگر میرا جی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیوپار کو جذبات کے تبادلے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

اس نظم میں میرا جی اپنے آپ کو دُکھوں کے تاجر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دُکھ انسان کا وہ خاص روّیہ ہے کہ جس کی پہلی کھوج آدم نے کی تھی۔ جب آدم اکیلا تھا تو اُسے ایک دُکھ لاحق تھا۔ پھر جب اسے حوّا عطا ہوئی تو دانۂ ممنوعہ سے دور رہنے کا دُکھ تھا۔ ایسے ہی اس دُکھ کو دور کرنے کے لیے جب اس نے شجرِ ممنوعہ سے دانہ کھالیا تو اسے جنت سے نکال دیا گیا اور یوں دُکھ کے سلسلے کی ابتدا ہو گئی۔ میرا جی نظم کی ابتدا میں اسی دُکھ کا احوال سناتے ہیں کہ ان کی گٹھری میں ہر طرح کا دُکھ موجود ہے۔ میرا جی نے زندگی کا ہر رنگ دیکھا جس کا اصل credit ان کے bohemian lifestyle کو جاتا ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے کہ:

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

سو ایسے میں میر اجی ہر شخص کے دُکھ کو سنتے ہیں، اس کو اپناتے ہیں اور پھر صدا لگاتے ہیں کہ کوئی ہے جو ان سے دُکھ لینا چاہے؟ اب یہاں تکنیکی اعتبار سے یہ دیکھنا اہم ہے کہ میر اجی نے جس کردار کا انتخاب کیا ہے، اس کو کیسے نبھاتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو میر اجی ایک تاجر (Salesman) یا فروشندہ کی مانند باقاعدہ مول تول کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ میرا دُکھ خالص ہے اور نقد دست یاب ہے، لیکن اس دُکھ کو خریدنے والے ہوشیار رہیں کہ یہ دُکھ جنھوں نے خریدے ہیں، وہ ہمیشہ اپنی منزل کو نہیں پہنچ پائے۔ ان دُکھوں کے حصول کے لیے شاعر نے اپنی زندگی کی ہر بازی لگا دی، لیکن اب وہ جیون ہار کے بھی خوش ہے کیوں کہ اس نے اس کے بدلے جگ کو جیت لیا ہے۔

یہاں دو سوال اہم ہیں۔ اوّل یہ میر اجی جس دُکھ کی بات کر رہے ہیں، وہ دُکھ کون سے ہیں اور دوم یہ کہ ان دُکھوں کا خریدار کون ہو گا؟ میر اجی جن دُکھوں کی بات کر رہے ہیں وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ خلشیں ہیں جو انسان کے دل کو کلبۂ احزاں بنا دیتی ہیں۔ ان میں سماجی دباؤ ہے، معاشی تنگیاں ہیں، لوگوں کا تلخ رویّہ ہے اور اپنی ذات پر اُٹھنے والے سوالات شامل ہیں۔ دوسرا دُکھ ہجر کا دُکھ ہے جو انسان کو سلوک کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ دُکھ کو پالنے اور بیان کرنے کی خواہش انسان کے خون میں بسی ہوئی ہے۔ ہر شخص اس کو ایک مختلف نام دیتا ہے۔ عربی کا ایک شعر دیکھیے:

انا المسموم ما عندی بترياق و لاراق
ادركاسا و ناولها الايا ايها الساقی

یعنی مجھے وہ زہر دیا گیا ہے جس کی کوئی دوا نہیں، سوائے ساقی شراب کا پیالہ میرے حوالے کر اور اُسے

بھر تا جا۔ یہ زہر دراصل حقیقت کا دُکھ ہے، کہ جو انسان کو اندر سے جلا تا رہتا ہے۔ اگر یہاں ثابت قدمی اختیار کی جائے تو انسان اپنی منزل پالیتا ہے، اور اگر یقین کا ہاتھ چھوٹ جائے تو اجل ہی اس کا مقدر بنتی ہے۔ میر اجی اس میں ایک فنکار کا دُکھ پیش کرتے ہیں جو کہ جہاں بھر کا کینوس ہے۔

یہاں دُکھوں کے خریدار سے مُراد وہ لوگ ہیں جو کہ میر اجی کی فکر اور جذباتیت سے متاثر ہیں اور وہی رنگ اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سو میر اجی یہاں ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ دُکھ کوئی عام دُکھ نہیں، سو یہاں لازمی ہے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا جائے۔ میرؔ کے یہ اشعار میر اجی کے اس حُسن اور ظاہری سوختہ پن پر پورا اترتے ہیں:

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں!
اک آگ مرے دل میں ہے، جو شعلہ فشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

❋❋❋

فاطمہ سعید

وہ جو کھوئے گئے (انتظار حسین): شناخت کے بحران کا بیانیہ

'وہ جو کھوئے گئے' ایسا افسانہ ہے جس میں انتظار حسین شناخت کے مسئلے کو پوری طرح بیان کرتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کیسے فساد، انتشار اور ہجرت کے بعد لوگ اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں جنھیں کچھ بھی یاد نہیں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا خود کا نام اور اُن کے ساتھ کیسے لوگ تھے اور کتنے لوگ تھے۔

کہانی ایسے ہی شروع ہوتی ہے کہ زخمی سر والا ایک کردار ہے جس کے سر پر گہرا زخم ہے اور اس کی آنکھ کھلتی ہے درخت کے تنے پر سے اور وہ اپنے ساتھ تین اور لوگوں کو پاتا ہے، اسی طرح ان کے نام ہیں باریش آدمی، نوجوان اور تھیلے والا۔ انتظار حسین انھیں کوئی نام نہیں دیتے مگر بس ایسے ان کی وضاحت کرتے ہیں یہ دکھانے کے لیے کہ ان کو اپنے نام بھی یاد نہیں۔ یہ ویسا ہی عمل ہے جیسے انسان کسی traumal suffering سے گزرے تو اس کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔

خیر بس اب یہ تین ایک دوسرے سے مخاطب ہونے لگتے ہیں اور بتانے لگتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ ہم میں جو ایک تھا وہ غائب ہے اور وہ کچھ اور نہیں سوچ پاتے پر اس ایک کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ اسی دوران انھیں کُتے کی آواز آنے لگتی ہے اور زخمی سر والا کہتا ہے میں جا کر دیکھتا ہوں۔ وہ جاتا ہے پیچھے یہ تین اُس کے انتظار میں ہوتے ہیں اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں کے دماغ میں کوئی سوچ نہیں آ رہی سوائے اس کے کہ وہ جو ہم میں سے نہیں رہا وہ کہاں ہے۔ ایسے ہی زخمی سر والا واپس آتا ہے اور اسے بھی وہاں کوئی نہیں ملتا

اور باریش آدمی کے کہنے پر جب وہ پھر اُسے تلاش کرنے نکلتے ہیں تو پھر اپنی جگہ پر واپس آجاتے ہیں۔ اسی طرح وہ وہاں واپس جانے لگتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔

جو کھو گیا اُس کا نام اور جنس:

باتوں ہی باتوں میں زخمی سر والا اُس آدمی کا نام پوچھنے لگتا ہے کہ آخر اُس کا نام کیا تھا جسے ہم تلاش کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ان سب کو یہ بھی یاد نہیں آرہا ہوتا اور بس ہر ایک پر یہ جُملے بولتے ہیں 'کیا عجیب بات ہے، اس سے ان کی حیرت اور کنفیوژن کا اندازہ ہونے لگتا ہے کس طرح وہ اس سے گزر رہے ہیں جب اُنھیں کچھ یاد ہی نہیں ہے۔ اسی دوران نوجوان ایک لڑکی کا ذکر اور خیال کرنے لگتا ہے کہ آخر وہ کہاں ہو گی اور تب سب سوچنے لگتے ہیں کہ کیا وہ جو ہمارے ساتھ تھا وہ عورت تو نہیں تھی؟ یہاں پر ہم انسانی ذات اور نیّت میں پائی جانے والی ہوس دیکھتے ہیں کیوں کہ سوچ کر اُنھیں افسوس ہوتا ہے کہ اگر عورت تھی تو ہم نے کافی اچھا ساتھی کھو دیا ہے اور اس کے ساتھ باریش آدمی جو شروع سے ہی مذہبی معلوم ہوتا ہے، اسے خرابی قرار دیتا ہے جس پر زخم کھانے والا شخص بُرا مناتا ہے۔

اچانک باتوں میں اپنی شناخت جاننا:

اب آگے کہانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چار بیزار آدمی باتوں ہی باتوں میں ایک دوسرے کے سامنے اپنی شناخت کو کھول کر رکھ دیتے ہیں کہ اُنھیں آہستہ آہستہ اِس صدمہ کے بعد بھی کچھ یاد آنے لگتا ہے کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتے تھے۔

باریش آدمی بتاتا ہے کہ وہ غرناطہ سے ہے اور پھر یہ بولنے کے بعد وہ چونک جاتا ہے اور پریشان ہونے لگتا ہے۔ اِسی طرح تھیلے والا بھی اپنی شناخت کشمیر یا مسجد الاقصیٰ سے جوڑتا ہے۔

نوجوان صدمہ میں بس سوچتا ہی ہے اور ایک دم اسے یاد آتا ہے کہ وہ جہاں آباد سے ہے۔ اُسے پھر

کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ یہاں کرداروں کو اپنا وہ وقت یاد آنے لگتا ہے جب وہ اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ ایسا منظر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے کہ دھواں ہے اور وہ لوگ اپنے گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔ یہاں انتظار حسین ہمارے سامنے تصویر کشی کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ کس طرح یہ سب کردار اپنے گھروں سے جان بچا کر ایسے بھاگے ہیں یہاں تک کہ انھیں اپنی خود کی ذات کی بھی خبر محسوس نہیں ہوتی۔

ایک دوسرے کی گواہی دینا:

یک دم ہم دیکھتے ہیں کہ اس کہانی میں یہ کردار ایک دوسرے کی گواہی دینے لگتے ہیں یعنی ان میں سے ایک بول پڑتا ہے کہ بھائیو گنتے وقت میں نے خود کو نہیں گنا تھا، اس وجہ سے شاید ہمیں ایک دوسرے میں کمی محسوس ہوئی اور پھر یہ سب ایسی مشکل میں پڑ گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔ اِن کی اِس حالت سے ہمیں ان کے صدمے کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح اِس سب نے اِن کو ذہنی چوٹ پہنچائی ہے کہ ہر بات پر ایسے حیرانی سے بھرپور response دیتے ہیں۔ اس میں ایک اور چیز کا عنصر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ہماری شناخت دوسرے لوگوں پر depend کرتی ہے۔ کس طرح دوسروں کا ہونا ہمیں مکمل کرتا ہے اور کس طرح دوسرے نہ ہوتے تو ہمارے اندر بھی کوئی existence یا وجود جیسا concept نہ ہوتا۔

ہماری شناخت کا مرحلہ پوری طرح دوسروں پر مبنی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی موجود انسان کی گواہی نہ دیتا تو کیا اسے بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ اِدھر موجود ہے؟ بالکل بھی نہیں، Our idea of self depends on process of othering۔ اسی دوران باریش آدمی بھی بڑی بات کرتا ہے کہ تمہاری بات کرنے کے لیے تو ہم لوگ بول رہے ہیں کس طرح وہ لوگ جو کھو گئے اور جو ختم ہو گئے ہیں وہ اب نہیں رہے۔ یہاں ہم ایک historical realism دیکھتے ہیں اور ہماری ذات دوسرے لوگوں اور اُن کی سوچ اور خیالات سے کتنی منسلک ہے۔

Jacques Laccan ایک مشہور فلسفی ہیں جن کا فلسفہ mirror stage اس پر پورا اُترتا ہے کہ کس طرح جب ایک بچّہ پیدا ہوتا ہے تو خود کو ماں کی نظر سے دیکھتا ہے مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے وہ خود کو آئینہ میں دیکھتا ہے معاشرے میں اور اس کلچر اور زبان میں جس میں خود کو تلاش کرتا ہے ایسے ہی وہ دوسروں پر پوری طرح dependent ہونے لگتا ہے۔

وہ جو کھوئے گئے اُن کی تلاش:

اِسی طرح یہ لوگ پھر سے اُسی بات پر آجاتے کہ کہاں ہے وہ جو ہم میں موجود تھا اور پھر سے وہ اپنے اپنے گھروں کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ اس میں نوجوان پھر اپنے باپ کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو جائے نماز پر چھوڑ آیا۔ وہ لوگ اس trauma کے ساتھ ایک survival mode میں نظر آنے لگتے ہیں اور افسانہ بھی کسی ایسے اختتام پر نہیں پہنچتا جہاں کوئی نتیجہ ہو مگر بس ایسے ہی وہ لوگ اس طرح کی مشکل میں ہوتے ہیں۔

شناخت اور نو آبادیات:

ہم اس افسانے میں دیکھتے ہیں کہ یہاں پر چند کردار دو قسم کی تاریخ لے کر چل رہے ہوتے ہیں:

۱۔ ذاتی تاریخ

۲۔ ملکی تاریخ

اِسی طرح جیسے اُنھیں اپنی ذاتی زندگی کے عناصر بھی بھول چکے ہوتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اُن کو یہ بھی یاد نہیں کہ اُن کی ملکی شناخت کیا ہے۔ وہ اُنھیں تو تلاش کر رہے ہیں جو کھو گئے ہیں مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی ڈھونڈ رہے ہیں کہ وہ لوگ کہاں ہیں اُن کو اپنی ذات کا بھی کچھ معلوم نہیں۔

اِسی طرح postcolonial world میں جتنی بھی قومیں گُزریں ہیں وہ اِس طرح کے trauma

سے ضرور گُزری ہیں جہاں اُنھیں نہ تو یہ یاد ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور وہ خود کون ہیں۔ پاکستان ہجرت کر کے یہاں آنے والے لوگ بھی ایسے حالات سے گُزرے اور اُنھوں نے ایسے ظلم برداشت کیے مگر وہ اب تقسیم ہو گئے تھے، وہ خود کو کھو چکے تھے۔ ہم اب کی اِس دنیا میں جیسے پاکستانی ہیں کیا ہمیں یاد ہے کہ ہمارے اجداد کون تھے اور کس طرح ہماری تہذیب ہندوستان سے ملی ہوئی تھی اور اُس میں رَچی بسی تھی۔ مگر اب ایسے شناخت والے لوگ ہیں جن کے پاس originality نہیں ہے اور ہم پوری طرح اس شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جو ہماری اَصل تھی۔

جس طرح انتظار حسین ان ہجرت کیے ہوئے لوگوں کا حال سناتے ہیں وہ کچھ ایسا ہی ہے جو ان قوموں کا ہوا جنھیں اپنی مٹی سے نکال کر کہیں اور ڈال دیا گیا۔ اس میں انتظار حسین مسلمانوں کی بات بھی کرتے ہیں کس طرح وہ ہر طرف سے دربدر ہوئے، مسجد الاقصیٰ (Al-Aqsa)، کشمیر اور اب مل کر نہیں رہتے مگر دوسروں کے ٹکڑوں پر۔

❋ ❋ ❋

اقرا انور

ریٹرن ٹکٹ

تئیس سال پہلے میں آرین کے ساتھ شہر آیا تھا، میں اپنے ساتھ تین کپڑوں کے جوڑے، ایک جائے نماز اور دو ریٹرن ٹکٹ لایا تھا۔ یہی میری تمام جمع پونجی تھی۔ شہر کی جگمگاتی روشنی، چمک دمک، بہتر زندگی کی امید اور خوش حالی کا وعدہ مجھ سمیت بہت سے مسافروں کو ایک مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر جب اس سراب میں پاؤں رکھو تو تپتی زمین، جھوٹ، فریب، آسیب، لالچ اور سفید آسمان کے علاوہ اس کے کھوکھلے وجود میں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کھوکھلے فریبی شہر پر اس کے ظالم، بے رحم اور فریبی شہری حکمرانی کرتے ہیں۔ جن کے لیے مجھ جیسے لوگ بے حیثیت اور بے وُقعت ہیں۔ اس بات کا اندازہ پہلی دفعہ مجھے تب ہوا جب میں ریلوے سٹیشن پر اترا، اترتے ہی ہجوم کے دھکوں، حبس اور چیل کی آنکھوں والے لوگوں نے میرا اس شہر میں استقبال کیا۔

اس شہر میں مجھے سایا کہاں نصیب ہونا تھا، یہاں تو سانس لینے کے لیے ہوا بھی نہیں ہے اور ہوا کی کمی ہر گُزرتے پل کے ساتھ سانس لینا مزید تکلیف دہ بناتی ہے۔ یہاں تک کہ شہر کی آبادی جیتے جاگتے لوگوں سے چلتی پھرتی لاشوں میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مگر سب اس شہر کے ماحول کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ان چلتے پھرتے مُردوں کو دیکھ کر کوئی بھی شخص آنکھ تک نہیں جھپکتا۔ اپنے مکّاری اور عیاری کے اوزار تیز کیے اس شہر کے مکین دھاک لگائے شکاریوں کی طرح مسافروں کا انتظار کرتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں یہاں اکیلا نہیں تھا، آرین بھی میرے ساتھ آیا تھا۔ میں اور آرین ایک ہی دن، ایک ہی وقت، ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور اس لمحے سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس نے مجھے ایک پل بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ اس کا وجود میرے لاشعور میں جیسے جذب سا ہو گیا ہو۔ مگر یہاں آنے سے پہلے مجھے اس کے وجود کا احساس اس قدر شدّت سے نہیں ہوا۔ حالاں کہ ہم دونوں سائے کی طرح پوری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ ایک ہی محلے میں پلے بڑھے، ایک ہی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ مگر ہم دونوں بچپن سے بالکل مختلف تھے۔ آرین باتونی تھا اور میں خاموش طبیعت، اُسے سگریٹ اور جام میں دل چسپی تھی اور مجھے میری کتابوں میں۔ وہ دُبلا پتلا سا تھا، اور میں گاؤں کا ایک پہلوان۔ اس کے دُبلے پتلے پنجر کے باوجود لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ اس کا غصّہ بہت تیز ہے اور مجھ سے تو کوئی پرندہ بھی خوف نہ کھائے۔ وہ سنیما دیکھنے جاتا تھا اور میری زندگی سکول اور گھر تک وقف تھی۔ ان سب تبدیلیوں کے باوجود میں آرین کا سب سے اچھا دوست ہوں۔ وہ میرا سایا ہے یا پھر میں اس کا، ہم دونوں اکثر اس بات پر بحث کرتے ہیں۔

آرین کو ہمیشہ سے شہر آنے کا شوق تھا اور مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ میرے ساتھ شہر میں آئے گا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو بچپن سے لے کر آج تک مجھے اس دنیا سے بچانے والا، مجھے سمجھنے والا اور میرا راز دار کوئی بھی نہ ہوتا۔ جب سکول میں آٹھویں جماعت کے لڑکے آدھی چھٹی کے دوران مجھے مارتے تو صرف وہ ہی مجھے بچانے اور چپ کرانے کے لیے آتا تھا۔ اور میں پڑھائی میں اس کی مدد کرتا تھا۔ ایک دن تو ان لڑکوں نے مجھے اتنا مارا کہ مجھے شُبہ ہونے لگا کہ اب میں زندہ نہیں بچوں گا۔ مگر وہ مجھے وہاں سے بھی بچا کر لے گیا۔ ان لڑکوں نے میرے بازو کی دو ہڈیاں توڑیں، میرے چہرے کو اپنے ناخنوں اور دانتوں سے مسخ کیا اور پھر مجھے تپتی چلچلاتی دھوپ میں دوزخ کی طرح جلتے ہوئے فرش پر مرنے کے لیے پھینک کر چلے گئے۔ وہ مجھے اٹھا کر میرے گھر لے کر گیا۔ مجھے پانی پلایا، میرا علاج کیا اور اس مصیبت کے وقت ہر پل میرے ساتھ رہا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آرین کو اس ظالم دنیا میں آنے کے معاوضے کے طور پر مجھے بخشا ہے۔

ایسے ہی ہم نے اپنی زندگی کے انیس سال گاؤں میں گزارے اور پھر گاؤں کے ایک شخص نے ہماری نوکری شہر کے بس سٹیشن پر پکی کروادی تھی۔ مجھے بس ڈرائیور کی نوکری ملی اور آرین میرا کنڈکٹر تھا۔ میں چُپ چاپ دن رات گاڑی چلاتا، اور وہ چِلّاتے، دھاڑتے مسافروں کے ساتھ لین دین کرتا اور اس طرح ہماری گاڑی گجومتہ سے نکلتی اور بھاٹی چوک تک جاتی۔ سارا دن اور ساری رات ہم اسی روٹ پر اپنی زندگی کا سفر طے کرنے لگے۔ روز نئے مسافر اپنی کہانیاں، امیدیں اور مقاصد لیے ہماری بس میں بیٹھتے اور ہم انھیں امانت کی طرح ان کی منزل تک پہنچاتے۔

امانت سے یاد آیا، ابھی ہمیں اس روٹ پر بس چلاتے کوئی چھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک مسافر نے آرین کو اپنا سامان پکڑایا اور کہا کہ جب تک وہ واپس آئے ہم اس کی امانت کو سنبھال کر رکھیں۔ وہ معصوم اسے گلے لگائے کوئی تیس منٹ کھڑا رہا۔ ساتھ والی بس میں مسافر اِدھر اُدھر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے چڑھ رہے تھے کہ آرین کو کسی نے پیچھے سے دھکا دیا اور اس کے ہاتھ سے وہ بکسہ نیچے گر گیا۔ بکسے کا گرنا تھا کہ اس میں سے ایک عجیب سی آواز آنے لگی اور جوں ہی وہ اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا اس میں سے لمبے لمبے، کالے، بھورے اور لال سانپ اپنا سر باہر نکالتے ہوئے نظر آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پُورا فرش زہریلے سانپوں سے بھر گیا، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اللہ نے جہنم کا عذاب اس بس سٹیشن پر بھیج دیا ہو۔ میں جو کہ پہلے ہی سے ڈرپوک ہوں، یہ دیکھ کر ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ آرین بھی میرے پیچھے اپنی جان بچا کر بھاگا۔ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں ہی امان جانی۔ دوسرے ڈرائیوروں سے سنا ہے کہ وہاں موجود لوگوں نے کوئی دس منٹ میں سانپوں کا صفایا کیا اور پھر بس سٹینڈ پر زندگی کا تسلسل یوں جاری رہا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مگر وہ دن جائے اور آج کا دن، میری بس میں کسی سپیرے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

یہی میرا اس شہر کے فریب کے ساتھ پہلا تعارف تھا۔ مگر اس سپیرے سے کئی گُنا دہشت نیلی پیلی چڑیلوں کی تھی۔ ہر بس ڈرائیور اور کنڈکٹر ہمیں اسی کے بارے میں کوئی نئی کہانی سناتا۔ کوئی کہتا کہ وہ ایک ذہنی

مریضہ تھی، تو کوئی اسے پیسان بُلاتا، جو کہ لوگوں کا خون پیتی ہے، تو کوئی اسے بھٹکی ہوئی روح بُلاتا۔ مگر میں نے ان کی باتوں پر کبھی بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نیلی چڑیل صرف ایک کہانی ہے اور اگر وہ واقعی میں ہے تو وہ مجھے کبھی نہیں ملے گی۔

ایک عورت روز رات بارہ بجے چوبرجی سٹیشن سے میری بس میں بیٹھتی تھی اور ہر روز اس کے ہاتھ میں ایک نیا مٹّی کا پیالہ نظر آتا تھا۔ وہ روز میری بس میں بیٹھتی اور اس کے بیٹھتے ہی بس میں قہقہوں، گھنگھروؤں اور موسیقی کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ بس میں کوئی رقص کی محفل برپا ہو۔ وہ سَیر ہو کر پیالے سے کھاتی اور آخری سٹیشن آنے تک یہی چلتا رہتا۔ میری طبیعت میں نہیں تھا کہ میں کسی عورت کو دیکھوں مگر ایک دن آرین نے تجسّس کے مارے اس سے بات چیت شروع کر دی، یہ سلسلہ کچھ بیس منٹ چلا اور پھر بس میں سنّاٹا چھا گیا۔ آرین نے مجھ سے کہا کہ بس خراب ہو گئی ہے اور سب مسافروں کو اپنا انتظام خود کرنا پڑے گا۔ جب میں نے یہ سُنا تو چونک کر پیچھے مڑا۔ آرین کا چہرہ مکمل طور پر سفید ہو چکا تھا اور وہ حواس باختہ نظر آرہا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر میں نے زیادہ کچھ نہیں بولا اور مسافروں کو اتار کر اپنے رستے پر ہو لیا۔ آرین نیلی چڑیل، نیلی چڑیل بولتا چلا جا رہا تھا، میں نے آرین سے کہا کہ آخر ایسا بھی کیا ہو گیا ہے، تو اس نے مجھے جواب دیا کہ 'میں نے اس کے پیالے میں دیکھا، پہلے تو مجھے لگا وہ قورمہ کھا رہی ہے، مگر وہ ہڈیاں، وہ نہ تو کسی مرغے کی تھیں اور نہ ہی کسی بکرے کی۔ اور پھر۔۔۔ پھر وہ ایک انسانی آنکھ اور کان چبانے لگی۔ تمھیں کیسے پتا چلا کہ وہ انسانی کان ہے؟ مجھے پتا ہے وہ نیلی چڑیل ہی تھی۔ آرین مجھے نیلی چڑیل کے بارے میں بتا ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ عورت بس کا پیچھا کر رہی ہے۔ جب میں نے اسے ذرا اور غور سے دیکھا تو میری بس کی نیلی پیلی لائٹوں میں اس کے بال سبز دکھائی دیتے تھے، اس کے ناخن اور ہاتھ کالے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جل کر کوئلہ ہو گئے ہوں اور وہ اس قدر بدصورت اور ہیبت ناک نظر آرہی تھی کہ میں سوچ میں پڑ گیا، آخر میں نے اس کا یہ چہرہ کیسے نہیں دیکھا۔

خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، وہ ایک کھوپڑی جس کا ایک کان کھایا جا چکا تھا، اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہمارے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ میں اور آرین دعا کرنے لگے، مگر اگلے دو گھنٹے تک وہ ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے بس مسجد وزیر خان کے سامنے روکی اور ہم دونوں بھاگ کر مسجد کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ مولوی صاحب کو اپنا دُکھ سنایا اور انھوں نے قرآن پاک اور منزل پڑھنا شروع کر دیا۔ اگلے دو ہفتے تک آنکھ بند کرتے تو نیلی چڑیل ہمیں خواب میں ڈراتی اور آنکھ کھولتے تو بس کا مالک ہمیں کام پر واپس آنے کے لیے دھمکی دیتا۔ بس پھر ہم نے مولوی صاحب سے ایک تعویذ لے کر بس میں لٹکایا اور اللہ کا نام لے کر بس سٹارٹ کی۔

جیسے جیسے رات کا وقت اور چوبرجی قریب آنے لگے، آرین ڈر سے کپکپانے لگا۔ آج وہ عورت بس سٹینڈ پر کھڑے ہونے کی بجائے چوبرجی کے چباروں سے لٹک رہی تھی۔ وہ اور اس کی نیلی پیلی سہیلیاں قہقہے لگاتی آتے جاتے لوگوں کو گھور رہی تھیں۔ تبھی اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور میری روح تک جھانکنے لگی۔ یہ سلسلہ دو سال چلتا رہا اور بالآخر وہ چڑیل مجھے دکھائی دینا بند ہو گئی۔ مولوی صاحب اور میری ماں کی دعائیں رنگ لائیں اور ہم نے سکون کا سانس لیا۔ آج بھی میں نیلی چڑیل یا اس کی سہیلیوں کی کوئی نئی کہانی سنتا ہوں تو مجھے وہ وقت اور خوف یاد آ جاتا ہے۔

ان تین سالوں میں آرین نے یہاں پر بھی دوست بنا لیے تھے مگر اس کے سب دوست وہ شرابی تھے جنھیں ہم نیلے گنبد کے بس سٹینڈ سے اٹھاتے اور بھٹہ چوک پر اتارتے تھے۔ جھومتے، گاتے، ہنستے اور پیار اور دوستی کا وعدہ کرتے ہوئے وہ بس میں چڑھتے اور کچھ وقت کے بعد یہ ہنسی، واویلے اور سکون میں تبدیل ہو جاتی۔ آرین کہتا تھا کہ یہ لوگ بہت اچھے اور بھروسے کے لائق ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ دیکھو، نشے کی حالت میں بھی یہ کسی کو دُکھ نہیں پہنچاتے، کسی کی بُرائی نہیں کرتے، کسی کو پریشان نہیں کرتے۔ تو پھر یہ لوگ کس طرح بُرے ہو سکتے ہیں۔ آرین کے سامنے میری زیادہ نہیں چلتی (کم سے کم ان دنوں میں)۔ وہ بھی ان کے ساتھ نشہ کرتا، باتیں کرتا اور پھر تھک کر سو جاتا۔ اس کے یہ دوست اچھے ہوں یا بُرے، مجھے وہ ایک آنکھ بھی نہ بھاتے تھے، کیوں کہ وہ مجھ سے میرے

سب سے اچھے دوست کو دُور کر رہے تھے۔ ایک دن سب نے بس میں اتنی الٹیاں کیں کہ بس میں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا، آرین نے بس کی صفائی کرنے میں کوئی دو گھنٹے لگا دیے مگر اس نے ان سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

آرین جو کسی کو بھی نہ بخشتا تھا ان کے آسیب میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ ان کی کوئی بات بھی اسے بُری نہیں لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس کے سچّے دوست ہیں مگر جب ایک دن ان میں سے ایک نے نشے میں مجھے مارنا شروع کر دیا تو آرین کا چہرہ غصّے سے تبدیل ہونے لگا اور وہ ان سے لڑنے لگا، پچھلے تین سالوں میں پہلی بار اس نے انھیں کسی چیز سے منع کیا تھا۔ مگر پھر تو وہ بھی شرابی۔ انھوں نے مجھے چھوڑ کر آرین کو مارنا شروع کر دیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے آرین کو اتنا بے بس دیکھا تھا۔ وہ شخص جو مجھے سب سے بچاتا تھا، اپنے ہی دوستوں کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس دن اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی بھی نہ تو اس گلی میں جائے گا اور نہ ہی ان کا چہرہ دیکھے گا۔ اور اس طرح مجھے اور ہماری بس کو اس عذاب سے نجات ملی۔

دو مہینے بعد مجھے اور آرین کو عید کے لیے گھر جانا تھا۔ ہم پچھلے تین چار سال سے گاؤں نہیں گئے تھے۔ وقت ہی نہیں ملا تھا اور نہ ہی میرا گاؤں جانے کا دل کرتا تھا۔ وہاں آخر میرا کون ہے؟ نہ گھر ہے، نہ ماں باپ، نہ سر پر چھت، نہ دوست، مگر انسان کو معاشرے میں رہنے کے لیے ایسے بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں جو وہ نہ چاہتا ہو۔ بس پھر کیا تھا، ہم نے اپنا سامان باندھا اور ریلوے سٹیشن کا رُخ کیا۔ میں صبح ۴ بجے والی ٹرین کا منتظر تھا۔ ٹرین آئی اور میں اس میں آرین کے ساتھ سوار ہوا۔ ٹکٹ ماسٹر میرا ٹکٹ دیکھنے آیا تو میں نے اپنی جیب سے اپنا ریٹرن ٹکٹ نکالا، مگر اب میرے پاس دو نہیں صرف ایک ہی ریٹرن ٹکٹ تھا۔

❋ ❋ ❋

علی منظور

دوسری شرط

''بھائی ذرا دو گھنٹوں کی خوشیاں تو پیک کر دو۔'' سوداگر نے دکان دار سے کہا۔

''یہ لیں جناب، ان کی قیمت ہو گی آپ کی زندگی کے دو سال۔'' دکان دار نے جواب دیا۔

''کافی مہنگی نہیں ہو گئیں؟'' سوداگر نے حیرت انگیز انداز میں شکوہ کیا۔

''بس کیا بتاؤں صاحب، مال کی پروڈکشن کم ہے اور خریدار زیادہ۔ اس لیے ہمیں قیمتیں بڑھانی پڑتی ہیں۔'' دکان دار نے مجبوری ظاہر کرتے ہوئے سوداگر کا شکوہ دور کرنے کی کوشش کی۔

سوداگر نے خوشیوں کا شاپر اٹھایا اور جذبات بازار سے باہر آ گیا۔ گھر کی راہ پر اس نے کئی لوگ دیکھے جو تڑپتے ہوئے اور بے صبری سے جذبات بازار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سوداگر نے چابی سے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

'' یہ دیکھو! میں تم سب کے لیے کیا خرید کر لایا ہوں۔'' اس نے بلند آواز میں اپنی بیوی اور بیٹی کو مخاطب کیا۔

''کیا لائے ہیں ابّا جان؟'' اس کی بیٹی نے پوچھا۔

'' یہ خوشیاں ہیں بیٹا۔ اب ہم اگلے دو گھنٹوں کے لیے بس خوشیاں منائیں گے اور غم کا نام و نشان نہ ہو گا۔'' اس نے جواب دیا۔

بچی نے گرم جوشی سے اچھلنا کودنا شروع کر دیا، مگر سوداگر کی بیوی نے ایک عجیب نظر سے سوداگر کی جانب دیکھا، جس کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔

''آپ پھر وہی خوشی اٹھا کر لے آئے۔ کتنی بار آپ کو منع کیا ہے، مت لایا کریں۔ آپ کی زندگی کے برس کٹ جاتے ہیں۔'' بیوی نے شکایت کی۔

''مجھے اپنی زندگی کی نہیں بلکہ آپ لوگوں کی خوشی کی زیادہ پرواہ ہے۔'' سوداگر نے ہمیشہ کی طرح یہی جواب دیا۔

''اور پھر دو سال کی ہی تو بات ہے۔'' اس نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔

اس کی بات سن کر اس کی بیوی ہمیشہ کی طرح بے زبان ہو گئی۔ اب خوشیوں کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ اگلے دو گھنٹوں میں سب کے چہروں پر مسکراہٹیں اور تبسّم تھا۔ کبھی سوداگر اپنی بیٹی کے ساتھ کھیلتا کودتا، تو کبھی اپنی بیوی کو لطیفے سُنا سُنا کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتا۔ گھر میں خوش حالی کی فضا تھی۔ یہ دو گھنٹے کیسے پلک جھپکتے ہی گُزر گئے، پتا ہی نہیں چلا۔

دو گھنٹے گُزرتے ہی گھر کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ سوداگر کی بیوی نے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

''کوئی بزُرگ ہیں، اپنا نام مایوسی بتاتے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' بیوی نے سوداگر کو اطلاع دی۔

''مایوسی؟ میں تو کسی مایوسی کو نہیں جانتا۔ خیر۔۔۔ ہٹو! میں دیکھتا ہوں۔'' سوداگر نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

وہ دروازے پر گیا اور سلام دعا کی۔

''کیا میں آپ کو جانتا ہوں؟'' سوداگر نے بزُرگ سے سوال کیا۔

''جی نہیں، نہ آپ مجھے جانتے ہیں اور نہ ہی شاید میں آپ کو جانتا ہوں۔'' بزُرگ نے جواب دیا۔

سوداگر کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔

''میرا نام مایوسی ہے۔ آپ بُرا نا منائیں تو آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' بزُرگ نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' سوداگر نے تھوڑے اطمینان سے کہا۔

''دراصل میں ایک بیمار بزُرگ ہوں، میری زندگی میں غم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب تو ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا ہے کہ مجھے کوئی کینسر نامی بیماری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے میرے پاس بہت کم وقت ہے۔ آپ کے گھر کے باہر سے گُزر رہا تھا تو ہنسنے کی آواز نے مجھے اس طرف کھینچ لیا۔ کیا آپ مجھے خوش ہونے کی وجہ بتا سکتے ہیں؟ میں اپنی زندگی کے آخری پل ہنسی خوشی گزارنا چاہتا ہوں۔'' بزُرگ نے روتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ یہ سُن کر سوداگر مایوسی کو گھر کے اندر آنے کی دعوت دیتا ہے۔

''سُن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو زندگی اور خوشی عطا کرے، مگر میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔ میرے پاس تو خود جینے کی چند وجوہات ہیں۔'' سوداگر نے جھجکتے ہوئے بتایا، جسے سُن کر مایوسی بھی مایوس ہو گیا۔ اس کی حالت سوداگر سے دیکھی نہیں جا رہی تھی کہ سوداگر کو یک دم کچھ سُوجھا۔

''آپ جذبات بازار کا رُخ کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے کہا۔

''جذبات بازار! وہ کیا ہے؟'' بزُرگ نے سوال کیا۔

''ایک ایسا بازار، جہاں سے آپ جذبات خرید سکتے ہیں۔ بس کچھ سالوں کی قیمت پر آپ خوشیاں خرید سکتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے سال وہاں کی کرنسی ہے۔'' سوداگر نے کہا۔

''آپ کو کہاں سے لگتا ہے میرے پاس زندگی کے چند سال بھی ہیں۔'' بزُرگ نے مایوسی سے کہا، جسے سن کر سوداگر شرمندگی سے خاموش ہو گیا۔

مایوسی، مایوس ہو کر اُٹھے اور اجازت طلب کی۔

''آپ کے وقت کا شکریہ، مگر شاید میرا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' مایوسی نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور باہر کی جانب چل دیا۔ اس کی یہ باتیں سوداگر کے ذہن میں پھنس چکی تھیں اور اسے تنگ کر رہی تھیں۔ رات بھر سوداگر اس کے بارے میں سوچتا رہا اور سو نہ سکا۔

کچھ روز گُزرے اور سوداگر نے ایک بار پھر خوشیوں کی خرید کے لیے جذبات بازار کا رُخ کیا۔ اس کے ذہن میں معمول کے مطابق اپنی بیٹی اور بیوی تھی۔ جذبات بازار پہنچ کر قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قطار حسبِ معمول لمبی تھی۔ اس کی نظر یک دم ایک اشتہار پر پڑی جو اس کے دائیں جانب لگا تھا اور قطار میں کھڑے تقریباً تمام افراد اس ہی اشتہار کو دیکھ رہے تھے۔ اشتہار رنگ برنگ اور چمکتے ہوئے انداز میں چیخ چیخ کر یہ بتا رہا تھا کہ ''پائیں کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی (immortality)، ابھی یہ آفر حاصل کریں اور ہو جائیں زندگی سے مالا مال۔''

اس کو پڑھ کر سوداگر کے دماغ میں کئی سوچیں ایک لمحے میں آئیں اور گُزر گئیں۔

''اگر میں یہ deal لے لوں تو میں immortal ہو جاؤں گا اور ساری زندگی اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ بغیر موت کے خوف کے رہ سکوں گا۔ اور ہاں وہ مایوسی کو بھی اپنی زندگی کے برسوں سے خوشیاں خرید دوں گا۔ کوئی limit ہی نہیں ہو گی، کمال نہیں ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور اس قطار سے نکل کر اشتہار کی جانب بڑھنے لگا۔

جیسے ہی اس کے قریب پہنچا تو ایک حسین و جوان لڑکی اس کے پاس آگئی اور کہنے لگی۔ ''سر آپ یہ ڈیل لینا پسند کریں گے؟''

سوداگر تھوڑے سے وقت کے لیے سوچ میں پڑا اور بولنے لگا۔

''میں لینا تو چاہوں گا مگر اس کی قیمت کیا ہو گی؟'' اس نے کہا۔

''سر ہماری مارکیٹ کی کامیابی کی وجہ سے ہم نے اپنے کسٹمرز کے لیے یہ اسپیشل آفر متعارف کروائی

ہے۔ اس کی کوئی خاص قیمت نہیں، بس ایک دو شرائط ہیں جو ان کو accept کرنے والے کو ماننا پڑیں گی۔" لڑکی نے جذبے کے ساتھ بولا۔

"شرائط، کیسی شرائط؟" سوداگر نے سوال کیا۔

"پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کو accept کرنے کے بعد واپس نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کسٹمر اپنی مرضی سے کسی قسم کے جذبات اپنے لیے نہیں خرید سکے گا، اسے تمام جذبات ہم دیا کریں گے۔ اگر آپ کو یہ شرائط قبول ہیں تو آپ پا سکتے ہیں کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی۔" لڑکی نے بیان کیا۔

سوداگر گہری سوچ میں پڑ چکا تھا۔ مگر اسے اپنے خاندان اور مایوسی کے خیال کے ساتھ ساتھ کبھی نا ختم ہونے والی زندگی کا لالچ اس کو لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

"میں اس deal کو لینا چاہتا ہوں۔" اس نے لڑکی سے کہا۔

"کیا بات ہے سر! بہت اچھا فیصلہ کیا ہے آپ نے۔ بس یہاں دستخط کر دیجیے اور immortality آپ کی ہو جائے گی۔" لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔

سوداگر نے جلدی سے دستخط کر دیے اور بہت خوشی میں وہ اس آفر کے document ہاتھ میں تھامے گھر کی جانب چل پڑا۔

"اب ہم ساری زندگی بلکہ ہمیشہ کے لیے زندہ اور خوش رہیں گے۔" سوداگر نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے کہا۔

"وہ کیسے؟" بیوی نے سوال کیا۔

"میں نے ایک deal خریدی ہے جو مجھے ہمیشہ کے لیے زندہ رکھے گی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا یہ پھر اُس جذبات بازار سے خریدی گئی ہے؟" اس کی بیوی نے غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بات چھوڑ دو تم اور عیش کرنے کی تیاری کرو۔'' سوداگر نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

اگلی صبح سوداگر مایوسی کے پاس پہنچا اور اسے ساتھ لیے جذبات بازار کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ ایک راہ گیر نے اسے اطلاع دی!

''تمھاری بیٹی کی حالت ٹھیک نہیں اور تم یہاں گھوم رہے ہو۔''

یہ سُن کر سوداگر کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ مایوسی کو وہیں چھوڑ کر گھر کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھر نہیں کسی اجنبی کے گھر آ گیا ہے۔ اندر بڑھا تو صحن میں دو سفید کپڑوں میں لپٹی لاشیں چارپائی پر اس کی منتظر تھیں۔

دوسری شرط یہ تھی کہ ''آپ کو جو بھی جذبات / emotions دیں گے وہ ہم دیں گے، آپ خود کوئی جذبہ / emotion نہیں خرید سکیں گے۔

❋ ❋ ❋

مہدیہ چیمہ

زیست

سفر کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ جیسے ہی ٹرین رُکی میں نے اس کے اندر قدم رکھا اور اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ میں بہت تازہ دم اور اچھا محسوس کر رہی تھی۔ اپنے دائیں بائیں دیکھا تو بہت سے مسافر بیٹھے تھے، ہر کوئی اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتھ والی نشست پر جوان عورت بیٹھی تھی جو کہ اپنے پورے دھیان اور توجہ کے ساتھ ایک سویٹر بننے میں محو تھی۔ اُسے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کے آس پاس کون بیٹھا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس عورت کے برابر ہی میں ایک بزرگ اماں جی تکیہ لگائے اپنی نشست پر بیٹھی تھیں اور اپنے سامان والا بکسہ اپنے پاؤں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بہ ظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنے پاؤں کے نیچے اپنے آرام اور ٹانگوں کو باآسانی رکھنے کے لیے رکھا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بے چین دکھائی دے رہی تھیں۔ کبھی پاؤں اس بکسے کے اوپر رکھتیں، کبھی نیچے۔ کبھی تکیہ نکال دیتیں اور کبھی واپس کمر کے پیچھے رکھ دیتیں۔ دیکھنے میں بے سکونی اس پر چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر میرے دل نے مجھے پُکارا اور کہا کہ آگے ہو کر معلوم کروں کہ ان بزرگ خاتون کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہے۔ دل نے یہ بھی احساس دلایا کہ مجھے ان کے کام آنا چاہیے لیکن اسی لمحے، اس خیال نے دل پر قابو پالیا کہ ''ابھی تو میرا سفر شروع ہوا ہے، تھوڑی دیر ٹھہر کر ان کی مدد کے لیے جاتی ہوں، ابھی بہت لمبا سفر باقی ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنی سوچوں میں پھر گُم ہو گئی۔ وقت گزرتا رہا اور ٹرین چلتی رہی۔ اس دوران کئی اور

نئے مسافر سوار ہو گئے۔ پہلے تو میں ان مسافروں کو غور سے دیکھتی رہی کہ کس طرح وہ ایک پُر جوش طریقے سے کھکھلاتے ہوئے ٹرین کے سفر کا آغاز کرتے، پھر جوں جوں وقت گُزرتا تھا تو ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی تھکان نمایاں ہونے لگتی۔

میری دائیں طرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سے میں باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی کئی کھیت دکھائی دیے، ذرخیز زمین جس پر ہری ہری فصلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک جگہ پر ایک ٹیوب ویل بھی تھا جس کے ارد گرد دیہاتی لباس میں ملبوس کئی کسان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں جو کہ ان کے کام میں ہاتھ بٹاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ چند عورتوں نے کوئی سامان گٹھڑیوں میں باندھ کر اپنے سروں پر لادا ہوا تھا۔ ساتھ ہی انھی کھیتوں میں مجھے چھوٹے چھوٹے بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، مٹی میں لوٹ پوٹ ہوتے، ہنستے اور کھکھلاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، جیسا کہ ان کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ تھی۔

ٹرین کا سفر یوں ہی چلتا رہا، لیکن ایک جگہ پر ٹرین رُک گئی اور میرے برابر بیٹھی بزرگ عورت کو پکارا گیا، اور نام لے کر کہا گیا کہ ''نور بانو بی بی کی منزل آگئی''۔ یہ سُنتے ہی وہ بزرگ عورت ٹرین سے باہر چل دیں۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی ان کے آس پاس بیٹھے لوگوں کے چہروں پر اُداسی چھاگئی۔ دیکھنے میں وہ لوگ اس بزرگ خاتون کے گھر والے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ پہلے تو مجھے یہ سب دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان خاتون کی منزل آگئی اور وہ چلی گئیں تو اس میں اداس ہونے والی بھلا کون سی بات تھی۔ اسی دوران ایک اور خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ میں نے دیکھا بھی تھا کہ وہ خاتون بے آرام ہیں تو میں نے آگے بڑھ کر ان کو آسانی فراہم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میں کیوں اپنی سوچوں میں گم رہی۔ کیوں نہ مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اچھا اور نیکی کا کام فوراً کر لینا چاہیے۔ نہ جانے زندگی پھر موقع دے یا نہیں۔

پھر سفر کے اگلے چند گھنٹے مجھے اسی پچھتاوے نے گھیرے رکھا کہ میں نے کیوں نہ آگے ہو کر نیکی حاصل کی۔

ٹرین چلتی رہی اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹرین رُکتی تھی، نئے مسافر آتے اور پہلے سے سوار چند مسافر اپنی نشستیں چھوڑ کر ٹرین سے اُتر جاتے۔ میں یہ معمول دیکھ کر اب اس کی عادی ہو چکی تھی اور اب مجھے پہلے کی طرح فرق نہیں پڑتا تھا کہ اگر کوئی ٹرین سے ایک دم سے اُتر بھی جائے تو مجھے اس انسان کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نئے لوگوں کا آنا، پُرانے لوگوں کا چلے جانا، یہ سب میرے لیے ایک بہت عام سی بات بن چکی تھی۔ یا پھر شاید میں اپنے کاموں میں اور اپنے خیالات میں اتنی مصروف رہنے لگی تھی کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں رہتا تھا کہ دوسروں کی زندگی میں کیا چل رہا ہے اور کب کوئی نئی سواری ٹرین میں سوار ہو رہی ہے اور کب کوئی ٹرین سے اتر رہی ہے۔ ان سب سے کوئی غرض ہی نہیں رہی تھی۔

انہی سوچوں میں گُم میں ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی لیکن اب باہر کا منظر بہت مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں بھی وہ کھیت، وہ صاف فضا، وہ نیلا آسمان نہیں دکھائی دے رہا تھا بلکہ ہر طرف اونچی اونچی عمارتیں، سڑکیں، گاڑیاں اور لوگوں کا رش دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان کا رنگ بھی بدلا ہوا تھا۔ یہ تصوّر کرنا مشکل تھا کہ جو آسمان دکھائی دے رہا ہے وہ کبھی نیلے رنگ کا بھی ہوتا تھا۔ مزید کچھ اور سفر طے کیا تو ایک جگہ دکھائی دیا کہ ایک دوکان کے باہر لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا، اور دو آدمی آپس میں لڑتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ باقی لوگ ان کو روکنے کی بجائے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے اور ان میں سے چند لوگ تو ایسا عمل کرتے دکھائی دیے کہ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ سامنے دو آدمی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے والے ہیں اور کچھ لوگ ان کی ویڈیو بنانے میں مصروف ہیں۔

پھر کچھ اور سفر طے کیا تو ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملا جو دیکھنے میں تو بہت خوب صورت تھا جہاں ہر طرف خوب صورت گھروں کی عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور ہر گھر کے آگے ایک نہیں بلکہ دو دو، تین تین نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لیکن اس پورے منظر میں مجھے کوئی انسان اور ان کے آپس کا interaction نظر نہیں

آیا۔ شاید ہر کوئی اپنے دفتر گیا ہوا تھا یا پھر ان بڑے بڑے، اینٹوں کے بنے پکے گھروں میں باہر نکل کر آس پڑوس کے لوگوں سے ملنے کا رواج ہی نہیں تھا، یا پھر شاید ان گھروں کے اندر ہی لوگوں نے اپنی مصروفیت کے اتنے ذرائع پیدا کر لیے تھے کہ ان کو باہر نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

وقت گُزرتا رہا اور شام ڈھلنے لگی۔ پورے جسم میں ایک عجیب سی تھکان محسوس ہونے لگی۔ ایک دم سے پُورے بدن میں درد اُٹھا جس سے میری حالت بُری ہونے لگی۔ درد کی شدّت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگی اور ایک موقع ایسا آیا کہ مجھ پر بے ہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اپنے ارد گرد لوگوں کا ہجوم دیکھا مگر کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عجیب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ تکلیف کے ساتھ ساتھ دل میں بے سکونی اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی بے چینی میں اُٹھ کر ٹرین کے اندر ہی چلنے پھرنے لگی، کبھی ٹرین کے اگلے ڈبے میں چلی جاتی اور کبھی واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ جاتی، مگر سکون تھا کہ کہیں بھی میسّر نہیں تھا۔

ٹرین کی رفتار آہستہ ہونے لگی اور پھر ایک دم سے ایک جگہ آ کر وہ رُک گئی اور اعلان ہوا کہ اگلا سٹاپ آ چُکا ہے۔ میں نے فوراً اپنا سامان اٹھائے بغیر اور کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بغیر تیزی سے اپنے قدم ٹرین کے دروازے کی طرف بڑھائے اور ٹرین سے اُتر گئی۔ باہر نکل کر مجھے ایک عجیب سے سکون نے آلیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اپنی ساری بے چینیوں اور تکلیفوں سے آزاد ہو گئی ہوں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے کئی برسوں کی قید سے بالآخر رہائی ملی ہے۔ اور پھر میں پُر سکون انداز میں جا کر ریلوے سٹیشن میں لگے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی اور کئی مسافروں کو ٹرین پر پُر جوش طریقے سے سوار ہوتے دیکھا اور کئی مسافروں کو اترتے ہوئے اور آ کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❋ ❋ ❋

محمد عمر جمیل

کچھ وقت

''جی کیا؟''

''میں کہہ رہی ہوں وقت ہو گا کچھ تمھارے پاس؟''

''ہاں ہاں! بولو بولو۔ سُن تو رہا ہوں۔'' اس نے سکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہی تھی۔۔۔ خیر چھوڑو۔ کوئی خاص بات نہیں۔'' حرا نے کچھ بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر اس کے بعد بتیاں بجھا کر دونوں سو گئے۔ آج مرتضیٰ کمبل کے بغیر سو رہا تھا۔ کیوں کہ اس کا کمبل دھلنے کے بعد چھت پر خشک ہونے کے لیے رکھا تھا۔

''سردی تو نہیں لگ رہی؟'' حرا نے مرتضیٰ سے پوچھا۔

''نہیں۔۔ نہیں آج تو سردی ہے ہی نہیں۔ سو جاؤ آرام سے۔''

مرتضیٰ گورنمنٹ ملازم تھا۔ ایمان دار تھا۔ لہٰذا کام سے چُھٹی نہ کرتا تھا۔ اس کی بیوی بھی سولہ برس سے اس کے ساتھ اٹھتی، اس کو ناشتہ دے کر تیار کر کے بھیجتی۔ اس کی ان قربانیوں کا مرتضیٰ نے کبھی واضح طور پر شکر ادا نہ کیا۔ البتہ مارتا نہیں تھا حرا کو۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بڑے ہو گئے تو حرا نے گاڑی چلانا سیکھ لی۔ اب گھر کے اندر اور باہر کے کام اس نے اپنے ذمّے لے لیے۔

مرتضیٰ صبح کو گھر سے نکلتا اور شام کے بعد فارغ ہوتا۔ اس کا کہیں اور آنا جانا نہ تھا۔ محنت کی زندگی نے

اس کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ دل کا تو وہ بہت اچھا تھا۔ لوگوں کی فکر، لوگوں کی مدد جیسے جذبات رکھتا تھا۔ مگر کچھ لوگ اس کے کھرے پن کی وجہ سے اس کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ اپنی زندگی گھر والوں کے بہتر نان و نفقے کے لیے گزار دی۔

ایک روز اپنے کام میں مگن تھا کہ اس کی نظر حرا پر پڑی۔

''طبیعت خراب ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ٹھیک ہوں۔ دوائی لے آئی تھی۔ چائے بناؤں آپ کے لیے؟'' اس نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

''سب پیئں گے تو پی لوں گا۔''

''بچے تو نہیں ہیں۔''

''بنالو پھر۔''

حرا نے مرتضیٰ کو شکایتی انداز میں دیکھا۔ جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ یہ میری بات کیوں نہیں سمجھتا۔ وہ اُٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

''چائے بنی نہیں ابھی تک؟'' اس نے پوچھا۔

آواز نہ آنے پر وہ اٹھا اور حرا کو ڈھونڈنے لگا۔ اس نے کچن وغیرہ میں دیکھا۔ اسے معلوم تو ہو گیا تھا کہ حرا کا مزاج نہیں ٹھیک۔ پھر اس نے بالکونی پر دیکھنے کے بعد کمرے میں دیکھا۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ ایسے جیسے کوئی بہت تھک کر، مایوس ہو کر سو جاتا ہے۔

''آج تو چھٹی ہے، آج کیسی تھکاوٹ؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور باہر آ گیا۔

وہ جا کر اپنا کام کرنے لگ گیا۔ مرتضیٰ اور حرا کی زندگی میں شادی کے بعد بہت سے مسائل آئے تھے۔ مرتضیٰ کے گھر والے اچھے سلوک کے مالک نہیں تھے۔ حرا کی زندگی میں مشکلات پیدا کرنا، اس کے کام میں

رکاوٹیں ڈالنا، میاں بیوی کی لڑائی کروانا وغیرہ، کے لیے مختلف حربے کرتے تھے۔ آخر ایک دن ان دونوں کو نکال دیا گیا۔ اپنی زندگی کا سفر زیرو سے شروع کرنے سے لے کر اچھے مالی حالات ہونے تک دونوں میاں بیوی نے ساتھ گُزارا۔

مرتضیٰ کی اَن تھک محنت تھی تو حرا کی بھی اَن تھک قربانیاں۔ نظر آنے والی چیزوں میں سے سب چیزیں ان کے گھر میں موجود تھیں۔ ایک مرتبہ اپنے بیٹے سے باتیں کرتے ہوئے حرا کے منھ سے نکلا ''تمھارے ابا تو بات نہیں کرتے۔''

''اماں جان! ان کی جس محنت کی وجہ سے وہ کڑے رہتے ہیں، اس محنت نے معاشرے میں عزّت کی زندگی گزارنے کے لیے ہمیں سہولیات بھی تو دیں۔ آپ بس شکر کیا کریں۔''

''ہم م م۔۔۔ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ شکایت تو۔۔۔''

''شکایت نہیں کی، جانتا ہوں۔ میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔''

ان کے بیٹے کی شادی قریب تھی۔ بیٹیاں چھوٹی تھیں لیکن سمجھ دار تھیں۔ حرا کا اپنے بچوں کی تربیت پر خاصا زور رہا۔ دن بھر گھر کے کام کرنا، بچوں کو پڑھانا، شوہر کی خدمت یہ اس کی مصروفیات تھیں۔ وہ اکثر اپنے بیٹے سے کہا کرتی تھی، ''میری بہو تمھاری وجہ سے مجھے بد دعائیں نہ دے، سلوک سے رہنا اس کے ساتھ۔''

اس پر وہ ہمیشہ کہہ دیتا ''آپ کو لگتا ہے میں بُرا ہوں۔''

''انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی بیٹا۔'' اس کی ماں جواباً کہہ دیتی تھی۔

کبھی کبھی شرارت میں اس کی بہنیں اسے کہہ دیتیں، ''بھائی! ہمیں بھول جاؤ گے شادی کے بعد؟''

''یہ چھوٹی ہیں۔ ان کی باتوں پر نہ جاؤ۔ بے وقوف ہیں۔'' بیٹے کے جواب دینے سے پہلے حرا ٹوک دیا

کرتی تھی۔

وہ سب کے سب مصروف رہتے تھے۔ شاید حرا سب سے زیادہ کام کر کے بھی سب سے زیادہ فارغ تھی۔ وہ اب ہر کسی سے بات کرنے سے پہلے اس بات کی عادی ہو چکی تھی کہ پوچھے: ''کچھ وقت ہے۔''

اس کے جواب میں شاید ہی کبھی اسے ''ناں'' ملی ہو، لیکن پھر بھی وہ یہ پوچھتی تھی۔ ایک دفع جب سب بیٹھے تھے تو حرا نے مرتضیٰ سے پوچھا:

''وقت ہے آپ کے پاس؟''

''ہاں ہاں! پوچھتی کیوں ہو۔ کہو، کیا بات ہے؟''

''بات تو کوئی خاص نہیں۔ بس ایسے ہی۔'' وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولی، ''بازار۔۔۔۔۔''

مرتضیٰ کو فون آ گیا اور اسے بھاگنا پڑا۔ حرا کی بات بیچ میں رہ گئی۔ بیٹا اس کے بعد مزاحیہ انداز میں کہنے لگا۔

''امّاں کاش میں بھی آپ جیسا بن جاؤں۔ کتنا ٹائم ہے آپ کے پاس!''

اس پر سب ہنس پڑے۔ حرا بھی ہنسی، مگر اس کے چہرے کے تاثرات اس کے بیٹے کی کہی بات کی نفی کر رہے تھے۔ وہ سب نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ ایسی جیسی آج کی دنیا میں سب گزارتے ہیں۔ ہر دن نیا ہوتا ہے۔ ایک ایسے ہی نئے دن کی صبح حرا کو کمر کی تکلیف ہوئی۔ عارضی سا درد سمجھ کر اس نے دھیان نہ دیا اور کام میں لگ گئی۔ اس کی اس تکلیف کا اندازہ کسی کو نہ ہوا۔ البتہ بیٹے نے پوچھ لیا۔

''اماں، طبیعت ٹھیک ہے؟ سست لگ رہی ہیں۔''

''بس ہلکا سا درد ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک۔'' اس نے ہلکی آواز میں کہا۔

اس کے بعد مرتضیٰ کام پر چلا گیا اور بچے تعلیم گھر۔ حرا کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ شدّتِ درد سے اس کے

آنسو نکل آئے۔ کھانا پکانے کا وقت تھا۔ اس نے کوشش کی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اس پر اُس نے یاد کیا کہ جب اس کے شوہر یا بچوں میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو وہ اپنے کام سے چھٹی کر لیا کرتے اور سارا دن حرا اُن کی تیمارداری کرتی۔ یہ سوچ کر وہ مایوسی کی سی حالت میں اُٹھی اور ہمت کر کے کچھ پکا لیا۔ جس سے روٹی کھائی جا سکے۔

دوپہر ہوئی تو اس کا بیٹا سب سے پہلے گھر آیا۔ اس نے حرا کو شدید درد میں پایا تو کہنے لگا ''ڈاکٹر کے پاس چلو اماں''۔

ڈاکٹر کے ہاں گئے، دوا کھانے سے اس کے درد کو کچھ دیر بعد سکون آ گیا۔ اب طبیعت دن بدن ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اک روز دوبارہ درد نے شدّت اختیار کی، اس بار حرا کو کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اُس نے خون نکالا اور شام کے وقت رپورٹ وصول کرنے کا کہا اور دوا دے کر گھر بھیج دیا۔

مرتضیٰ حسبِ معمول اپنے کام پر تھا۔ گھر پہنچا تو اُسے آشنا کروایا گیا حرا کی طبیعت سے۔

''سو رہی ہے وہ؟''

''ہاں جی! ابھی لیٹیں، کام بہت تھا ان کو۔''

''ہاں کام تو ہوتے ہیں اُسے۔''

مرتضیٰ پریشان نہیں تھا پر مطمئن بھی نہیں تھا۔ ویسے وہ گھبرانے والا نہیں دکھتا تھا، مگر رپورٹ نہ لینے جانے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

''ڈاکٹر نے آج ہی رپورٹیں لینے کا کہا تھا؟''، ''ڈاکٹر نے پریشانی کی کوئی بات تو نہیں بتائی؟''، رپورٹ خراب آنے کے بھی کچھ خدشات ہیں؟'' مرتضیٰ نے اپنے بیٹے سے کچھ اس طرح کے سوالات کیے۔

آج اس نے صحیح سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ رپورٹس لینے کا وقت قریب آیا۔ وہ جانے لگا تو جاتے جاتے حرا کو ہلکا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اکثر وہ اس بات سے چڑ جاتا تھا کہ جب حرا اسے کسی کام سے یا بے وجہ بلاتی

تھی۔ آج اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بلائے۔ لیکن حرا ایسے تھی جیسے خلوت طلب کر رہی ہو۔

خیر وہ گیا۔ کلینک پہنچا تو ذرا سے انتظار کے بعد اسے رپورٹیں مل گئیں۔ جلد باز طبیعت کا مالک مرتضیٰ آج انتظار سے بے چین بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے سوچا رپورٹیں کھولوں پر ہلکی سی نکال کر اس نے واپس لفافے میں رکھ دیں۔ پھر اس نے کچھ سوچا۔ تھوڑی ندامت کے اثرات اس کے چہرے پر جھلکے۔ اس نے رپورٹیں نکالیں اور غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ منٹ کے بعد اس نے رپورٹیں لفافے میں ڈالیں اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ اسے آج اپنا بوجھ کئی گنا زیادہ محسوس ہوا۔ اس نے سوچا کہ یہ کسی احساس کا بوجھ ہے؟ یا پھر کسی ندامت کا؟ انسان ایسا کیوں ہے؟ اسے کیوں کسی شے کی قدر بڑی دیر کے بعد ہوتی ہے؟ مرتضیٰ کو حرا کے ساتھ شروع کے دن یاد آ گئے جب اس کے پاس حرا کے لیے وقت تھا، جذبات تھے اور قدر تھی۔ اس نے سوچنے کی بڑی کوشش کی کہ ایسا کب ہوا جب میں حرا سے بے خبر ہو گیا۔ پھر اس نے خود کو تسلی دی اور کہا کہ ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ یہ محبت وغیرہ کے جذبات تو وقتی ہوتے ہیں۔ محبت تھی تو میں اس کے لیے محنت کرتا تھا۔ شاید یہ دلیلیں اس کی تسلّی کے لیے کافی نہ تھیں۔ اس لیے وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا کرسی سے مشکل سے اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس کا گھر پاس ہی تھا۔ لیکن اس کو میلوں دور محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اندر جلد پہنچنے کی بے چینی تھی، مگر راستہ تھا کہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اسے پہنچنا تھا حرا کے پاس لیکن اسے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں کسی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے چل رہا ہو، اتنا ہی دلدل میں پھنس رہا ہو۔ وہ آہستہ چلنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اسے ہر چیز اپنی ہی طرف دیکھتی اور یہ کہتی دکھائی دے رہی تھی ”دیر نہیں کر دی!“، ”جلدی! وقت کم ہے اب۔“ چلتے چلتے اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شور، سارا گند اور ساری بے ترتیبی اسی نے کی ہے، شہر تو بہت معصوم ہے۔

پتا نہیں کتنی دیر کے بعد وہ آج گھر پہنچا۔ وہ نادم تھا اور گھر کے اندر جانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ دروازے پر کھڑا رہا تو اچانک اس کے بیٹے نے دروازہ کھولا جو خود بھی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ بیٹے نے باپ کو پریشان دیکھا اور بھانپ گیا۔ اس نے باپ سے پوچھا۔

''کیا کہتی ہیں رپورٹیں؟''

''تمھارا کوئی ڈاکٹر ہے جاننے والا؟'' اس نے دبی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر، کس چیز کا؟'' اس نے تجسّس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''گردوں کا، ڈھونڈو کوئی اچھا ڈاکٹر۔''

یہ کہہ کر وہ حرا کے کمرے کی طرف بڑھا تو بیٹے نے آواز دے کر پوچھا۔

''کتنا وقت ہے امی کے پاس؟'' اس بار اس نے کچھ سوالیہ انداز میں پوچھا۔

مرتضیٰ جواب دیے بغیر چل پڑا۔ حرا کے پاس پہنچا، وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ حرا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی:

''وقت ہے کچھ آپ کے پاس؟''

''ہاں ہاں! ہے وقت۔۔ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے! اٹھو چلیں۔'' وہ فوراً بولا۔

یہ سُن کر حرا چپ سی ہوئی اور دوسری طرف کروٹ کر کے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

❋❋❋

شعبان احمد

کالے بِلّے

دوران تقریر میری نظر ایک گیارہ سالہ لڑکے پر پڑی جو جماعت ہفتم کی قطار کا پہلا طالب علم تھا۔ یہ ایک مہینے میں چھٹا سکول تھا جہاں مجھے تقریر کرنا تھی۔ باتوں سے بات چل پڑی اور الفاظ بغیر سوچے سمجھے میرے منھ سے نکلے جا رہے تھے۔ یہ قریب قریب اس وقت کی بات ہے جب شہر میں کالے خونی بِلّوں کا راج تھا۔ ان بِلّوں میں اور عام بِلّوں میں کافی فرق تھا۔ جہاں لوگ بازاروں میں جا جا کر عام گھریلو بِلّے خرید کر لاتے تھے، وہیں یہ وہ بِلّے تھے جن کے ساتھ کھیلنے کی بجائے ان کا سن کر ہی بچے سہم جائیں اور جب تک ان کو چار پانچ پیروں اور اللہ والوں کو نہ دکھایا جائے، بچے اپنی اصل حالت میں واپس نہ آتے۔

ان کالے بِلّوں میں یوں تو بہت زیادہ خاص باتیں تھیں جو ان کو دوسرے بِلّوں سے علیحدہ کرتی تھیں، مگر ان میں سے چند کے بارے میں بیان کرنا ضروری ہے۔ یہ عموماً پورے شہر میں دندناتے پھرتے تھے، لیکن ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ سب انسانوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ عام طور پر دانائی اور حکمت ہمیں بڑے بزرگوں کے ہاں ہی نظر آتی ہے جو ہاتھ دیکھ کر مستقبل پڑھ لیتے ہیں اور اپنی پھونکوں سے سالہا سال کے پرانے قفل کھول دیتے ہیں۔ پر اس شہر کا رواج اس سے اُلٹ معلوم ہوتا تھا۔ یہ کالے بِلّے اس انسان کو یا پھر زبان عام میں کہیں تو اس دانا کو نظر آتے تھے جس کی عمر عام طور پر اٹھارہ سال سے کم ہو۔ اٹھارہ سال سے زیادہ عمر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دانائی بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ کوئی چند ایک جن پر وہ کالے بِلّے حملہ کر چکے ہوں وہ اس کو ہفتم

جماعت کے گیارہ سالہ لڑکے، جس نے پتلون سینے تک باندھی ہو اور سفید رنگ کی شرٹ پر مٹی کے اتنے داغ لگائے ہوں، جیسے وہ کالے بِلّوں سے کشتی کر کے آیا ہو، کی آنکھ سے چمکتے موتیوں میں دیکھ لیتے ہیں۔

یہ بات پورے شہر میں پھیل چکی تھی کہ کچھ ایسے بِلّے آئے ہیں جن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ دِکھنے میں عام بِلّوں جیسے ہیں پر یہ گوشت کھانے کی بجائے گوشت نوچتے ہیں۔ چوں کہ یہ بڑوں کو نظر نہیں آتے تو پورے شہر میں یہ بات پھیلنے کے باوجود بھی ایک افواہ رہی اور لوگوں نے اس پر کان نہ دھرے۔ آہستہ آہستہ ان کالے بِلّوں نے لوگوں کے گھروں تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ انسانی معاشرے میں اتنا گھل مل گئے تھے کہ بھرے بازاروں میں بھی ملتے اور خالی گلیوں میں، ہر گھر میں بھی ملتے اور دفاتر کی زینت بھی بن گئے، حتیٰ کہ مساجد میں بھی یہ کالے بِلّے دندناتے پھرتے نظر آنے لگے۔ ہر وہ جگہ جہاں اٹھارہ سال سے کم عمر انسان کی موجودگی ہو سکتی تھی یہ بِلّے وہاں اپنے ڈیرے ڈالنے لگے۔ ان کی کثرت کی وجہ سے کم عمر انسان ہجوم میں جانے سے گھبرانے لگے۔ ایک وقت ایسا آیا جہاں بچے ان بِلّوں کی موجودگی کو دُور ہی سے بھانپ لیتے اور والدین اس بات سے پریشان ہونا شروع ہو گئے کہ ان کے بچے بدتمیز ہو گئے ہیں، نہ وہ سکول جاتے ہیں، نہ ہی مسجد اور نہ بازار۔

شہر کے تمام بچوں کو خاموشی کی بیماری لگ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا محسوس ہونے لگا کہ پورے شہر میں گونگے اور بہرے بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس خاموشی کی بیماری کی خاص بات یہ تھی کہ یہ چھوٹے بچوں، جو کہ ماں کا دودھ پیتے تھے ان میں نہیں تھی۔ جب تک بچے ماں باپ کی گود میں رہتے وہ بالکل ٹھیک بولتے اور سنتے تھے۔ لیکن جیسے ہی وہ کالے بِلّے کو دیکھ لیتے تو وہ ڈرنا شروع ہو جاتے اور اگر کالے بِلّے اس پر حملہ کر دیتے تو پھر وہ گونگے ہو جاتے اور کچھ نہ بولتے۔

یہ بیماری شہر کی ہر گلی کوچے اور گاؤں میں پھیلنے لگی۔ دیہات کے بچے جو کہ اچھل کود کی وجہ سے جانے جاتے تھے ان کو بھی زنگ لگنا شروع ہو گیا تھا۔ گارے کی بنی دیواروں میں انگلیاں مار کے بچے اب مٹی باہر نکالنے کی بجائے اس میں انگلی ڈال کر دیوار کو پلستر کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی معصومیت جس سے وہ شہر جاتے وقت

دیواروں پر لکھے اشتہارات پڑھا کرتے تھے، کھو چکے تھے کیوں کہ اب وہ سکول جانا چھوڑ چکے تھے اور اس کی ایک وجہ تھی اور وہ تھی کالے بِلّے۔

شہر کی انتظامیہ بھی اس حالت سے بہت تنگ آچکی تھی اور یہ بیماری ان کی سمجھ سے باہر تھی کہ ایک گھر میں پیدا ہونے والے جڑواں بچے جن کا رنگ، ناک اور چہرہ تک ایک جیسا تھا۔ دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے اور دونوں بچے اتنا پیارا بولتے تھے۔ ان کی معصومیت کے آگے ہر چیز ڈھیر ہو جاتی۔ پھر اچانک ان میں سے ایک بچہ بولنا چھوڑ دیتا ہے۔ جب کہ دوسرا بالکل صحیح رہتا ہے۔ اس طرح کے کیس پورے شہر میں ملنے لگے تھے۔

کٹی پتنگ کو دیکھ کر بغیر جوتا پہنے ہاتھ میں روٹی کا رول بنائے دوڑنے والے بچے اب آسمان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کھلے آسمان میں ہر طرف سرخی پھیل جاتی تھی جس کو دیکھ کر ان کا دم گھٹتا۔ اگر وہ چھت کے نیچے ہوتے تو بھی ان کا سانس اُکھڑتا۔ گویا کہ کائنات کا کوئی حصّہ نہ بچا جو اِن کو پناہ دیتا۔ ان کی لاچارگی کو ان کی معصومیت اور لاشعوری طور پر کی گئی حرکت سمجھ کر نظر انداز کیا جانے لگے۔

ایک کم عمر بچے سے کیا ہی توقع کی جاسکتی تھی لیکن پھر بھی ان میں کوئی اتنے بہادر ہوتے جو بِلّوں کو ختم تو نہ کر پاتے، لیکن ان کالے بِلّوں کے منھ پر تھوک ضرور دیتے، تاکہ وہ عبرت حاصل کر سکیں۔ ان کی خاموشی کے پیچھے ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈرے سہمے جب یہ ماں باپ سے لپٹتے تو ماں باپ کو یہ احساس ہی نہ ہوتا کہ آج ان کا بچہ ان سے لپٹ کر کیا کہنا چاہتا ہے، بلکہ وہ اس کو اس کے لاڈ پیار کا طریقہ سمجھتے اور ان کالے بِلّوں کی خراشوں کے جراثیم ان بچوں کی خاموشی کی وجہ بن جاتے۔

شہر کی انتظامیہ کی بہت زیادہ تگ و دو کے بعد ایک ایسا بچہ مل گیا جو مکمل طور پر خاموش ہونے کے بعد بول پڑا۔ یہ خبر اہلِ شہر کے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا اور جگہ جگہ جشن منائے جا رہے تھے۔ بچہ ایک ہی فقرہ بار بار دہرائے جا رہا تھا اور وہ تھا ''میں نے اس کی آنکھ نکال دی''، ''میں نے اس کی

آنکھ نکال دی"۔ جب بچہ پُر سکون ہوا تو اس سے پوچھ گچھ شروع ہوئی کہ کس نے، کس کی، کس وجہ سے آنکھ نکال دی؟ بچے نے اپنی آنکھیں اوپر کر کے بات سنانا شروع کر دی۔ اس کا سامنا ایک کالے بِلّے سے ہوا تھا اور اس سے پہلے کہ کالا بِلّا اس کا جسم نوچ کھاتا، اس نے اپنے پنجوں سے اس پر حملہ کر دیا۔ اور اس کی ایک آنکھ نکال کر پھینک دی۔ اب پورے شہر میں ایک آنکھ والے زخمی کالے بِلّے کی تلاش شروع ہوئی تا کہ اس کو پکڑ کر دیکھا جائے کہ یہ مخلوق دِکھنے میں کیسی ہے، تا کہ باقی بچوں کو گونگے ہونے سے بچایا جا سکے۔

آخر کار اس کالے بِلّے کو ڈھونڈ لیا گیا اور پتا چلا کہ ایسے بِلّے تو ہر جگہ موجود تھے۔ ان کی رسائی مساجد، مندروں اور کلیساؤں سے لے کر بازاروں تک تھی۔ پورے شہر میں ان بِلّوں کو پکڑنے کا حکم نامہ جاری ہو چکا تھا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ماں باپ اپنے گونگے بچوں سے اشاروں کنایوں میں ان کالے بِلّوں کا حُلیہ پوچھنے میں کامیاب ہو گئے۔ جیسے ہی کسی کو یہ اطلاع ملتی کہ اب وہ کالے بِلّے کی آنکھیں نکال چکے ہیں وہ بچہ بولنا شروع کر دیتا۔

اپنی تقریر کے اختتام پر میں نے اپنے میزبان سے اس میلی شرٹ والے بچے کو بلانے کا کہا۔ جب تک وہ اس کو میرے پاس لائے، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھنا چاہا پر وہ آگے سے کچھ نہ بولا۔ ایسے جیسے ڈرا سہما ہو، لیکن پھر بھی کچھ بتانا چاہتا ہو۔ یہ سکول گونگے بہرے بچوں کا سکول نہ تھا۔ اس بچے کی خاموشی مجھے تیس سال واپس لے گئی اور میں نے انتظامیہ سے کہہ کر اسکول میں کالے بِلّے کی تلاش شروع کر دی۔

❋ ❋ ❋

محمد ہریرہ

ماں کی محبت

گلاب کے پھول سے تو ہم سبھی واقف ہیں، ایسا پھول جو ہر جگہ شامل ہے، وہ پھول جو غم اور اداسی دونوں کا سہارا ہے، جس کی خوشبو کو محسوس کرتے ہی ارد گرد سب کچھ کھل اٹھتا ہے۔ ماں بھی ایک پھول ہی ہے۔ خوشبو سے بھرا پھول۔ جو کئی بار مرجھا بھی جائے نا تو گلاب کے پھول کی طرح نہیں کہ اپنا وجود کھو دے۔ ماں تو ایک ایسا پھول ہے جو مرجھا کر بھی از سر نو کھل اُٹھتا ہے۔ ماں کی خوشبو کبھی مدھم پڑتی ہی نہیں۔ ماں تو وہ احساس ہے جو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس احساس تک رسائی ممکن نہیں۔ ''ماں'' یہ جو لفظ ہے اسی سے ماں کی محبت اور خود ممتا کا احساس ہوتا ہے۔ ''محبت'' اور ''احساس'' بس ان دو لفظوں کا مجموعہ ہی ''ماں'' ہے۔ اولاد کے لیے ماں خالق کائنات کا ایک معجزہ ہے، نعمت ہے، عطا ہے اور زندگی کا حسین ترین احساس۔ ایسا حسین اور خوب صورت احساس جو ہر حال میں اولاد کے لئے ڈھال ہے جیسے بنجر زمین کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اولاد کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت اور احساس کے نام پر بہت سے رشتے ملتے ہیں لیکن مضبوطی ماں کے رشتہ میں ہوتی ہے۔ سب رشتے ضرورت، مطلب اور مفاد کے ہوتے ہیں۔ چہرے رنگ بدلتے ہیں یا پھر رشتے۔ سب کچھ بدل جاتا ہے لیکن نہیں بدلتی تو ماں نہیں بدلتی۔ لوگ اس احساس اور محبت کو اجنبیوں میں تلاش کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک شخص قریب المرگ تھا مگر نہ تو اس کی زبان سے کلمہ جاری ہوتا تھا اور نہ ہی اُسے موت آتی تھی۔ وہ نہایت تکلیف میں تھا۔ صحابہ میں سے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ساری کیفیت بتائی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا اس شخص کی والدہ زندہ ہے ؟ بتایا گیا زندہ ہے مگر اس سے ناراض ہے۔ تب آپ نے فرمایا اس کی والدہ سے کہا جائے کہ وہ اسے معاف کر دے۔ جب والدہ نے معاف کرنے سے انکار کیا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ لکڑیاں اکٹھی کریں تاکہ اُس شخص کو جلا دیا جائے۔ جب اُس کی ماں نے یہ حالت دیکھی تو فوراً معاف کر دیا۔

جب ماں نے اُسے معاف کیا تو پھر اس شخص کی زبان سے کلمہ بھی جاری ہو گیا۔ ماں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ ماں کائنات کی سب سے قیمتی متاع اور سب سے عظیم سرمایہ ہے ۔ اس کی شفقت و محبت اور خلوص و وفا کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ماں جنّت کا وہ پھول ہے کہ جس کے بغیر زندگی بے معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین۔

❁❁❁

فاطمۃ الزہرا

حکایاتِ سعدی کی افادیت (مکالمہ)

ماریہ: آپ یہ کون سی کتاب اتنی توجہ اور دل چسپی سے پڑھ رہے ہیں؟

عبداللہ: ماریہ، یہ کتاب جو میں پڑھ رہا ہوں، اپنے عہد کے بہت بڑے مصلح اور دانش ور شیخ سعدی کی حکایات اور اخلاقی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

ماریہ: کیا میں اتنی اعلیٰ کتاب کے مطالعہ میں آپ کے ساتھ شریک ہو سکتی ہوں؟

عبداللہ: کیوں نہیں۔۔۔ضرور۔

ماریہ: تو کیا آپ پہلے مجھے شیخ سعدی سے متعارف کروا سکتے ہیں؟

عبداللہ: جی ماریہ، ضرور۔

مصلح الدین، شیخ سعدی آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے یعنی ۱۲۱۰ء کو شیراز، ایران میں پیدا ہوئے۔ اور ان کی وفات ۱۲۹۱ء میں ہوئی۔ انھوں نے مدرسیہ نظامیہ (بغداد) سے رائج علوم میں تعلیم حاصل کی۔ وہ فلسفہ، ادب اور شاعری میں پہچان رکھتے تھے۔ انھوں نے اور بھی بہت سی کتب لکھیں، تاہم گلستان سعدی اور بوستان سعدی کو زیادہ شہرت ملی۔ ان کتب میں سے گلستانِ سعدی کلام اور حکایات کا مجموعہ ہے۔ جبکہ بوستان میں حکایتوں کے پیرائے میں اخلاقی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتب کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور علمی مدارس کے نصاب میں طویل عرصے سے شامل ہیں۔

ماریہ: بہت عمدہ۔

عبداللہ: تو آیئے، اب ان کی چند منتخب حکایات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جن میں شیخ سعدی ایک سخی انسان کے بارے میں، دنیا کے بارے میں، اپنے قریبی دوست کی ضرورت سے بے خبر رہنے کے بارے میں، اللہ کی نعمتوں کا شُکر ادا کرنے کے بارے میں، بے موقع بولنے کے بارے میں، خاموشی کے فوائد اور علیحدگی اختیار کر لینے والے احباب کے ساتھ سلوک کے بارے میں نہایت اعلیٰ بات کر رہے ہیں۔ جو انسانی قدروں اور گہرے فلسفے سے بھری ہیں۔

ماریہ: یہ تو بہت ہی اعلیٰ بات ہے۔

عبداللہ: تو آیئے، اب ہم ان کی حکایات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

حکایت ۱۔ میں ساری زندگی دو بندوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہا۔
ایک وہ جس نے اللہ کے نام پر دیا ہو اور غریب ہو گیا ہو۔
دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور اللہ کی پکڑ سے بچ گیا ہو۔

حکایت ۲۔ میرے اچھے وقت نے دنیا کو بتایا کہ میں کیسا ہوں اور
میرے بُرے وقت نے مجھے بتایا کہ دنیا کیسی ہے۔

حکایت ۳۔ ایک دن شیخ سعدی کے گھر ان کا ایک پرانا دوست کچھ رقم مانگنے آیا۔ شیخ سعدی نے دوست کو رقم دے کر رخصت کیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔
بیوی کہنے لگی کہ اگر رقم کی واپسی کی امید نہیں تھی تو کوئی بہانہ کر دیتے۔
شیخ سعدی نے کہا، یہ بات نہیں ہے، بلکہ رونا اس پر آرہا ہے کہ میں اپنے دوست

کی ضرورت سے اس قدر بے خبر کیسے رہا کہ اُسے خود میرے دروازے پر آنا پڑا۔

حکایت ۴۔ شیخ سعدی سے کسی نے پوچھا: کیسا حال ہے؟
جواب دیا: اللہ کی نعمتیں کھا کھا کر میرے دانت ٹوٹ گئے لیکن زبان پھر بھی ناشکری سے باز نہیں آتی۔

حکایت ۵۔ میں آج تک اپنی خاموشی پر نہیں پچھتایا۔
جب بھی پچھتایا، اپنے بول پر پچھتایا۔

حکایت ۶۔ اس سے تو خاموشی بہتر ہے کہ کسی کو دل کی بات کہہ کر پھر اس کو کہا جائے کہ کسی سے نہ کہنا۔

حکایت ۷۔ جو دُکھ دے، اسے چھوڑ دو۔
مگر جسے چھوڑ دو، اسے دکھ نہ دو۔

ماریہ: واہ، کیا بات ہے۔
آپ نے مجھے نہایت عمدہ کتاب سے متعارف کروایا ہے۔ میں یہ کتاب خریدنا چاہوں گی تاکہ حکایات، اقوال اور اچھی شاعری پر مشتمل اس کتاب سے ہمیشہ فائدہ حاصل کر سکوں اور اب میں اپنے ساتھی پڑھنے والوں کو بھی اس کے بارے میں آگہی دوں گی۔

❋ ❋ ❋

پنجابی

طاہر سحیل فاروق

امرتا پریتم دیاں کہانیاں تے شاعری دا فکری و فنی جائزہ

امرتا پریتم اک پنجابی شاعرہ، ناولسٹ تے مضمون نگار نیں۔ اوہ ۳۱ اگست، ۱۹۱۹ء نوں گجرانوالہ وچ پیدا ہوئیاں۔ آپ دا تعلق ایسے خاندان نال سی جو تعلیم دی حوصلہ افزائی کردا سی۔ ایہو ہی وجہ سی کہ آپ نے کافی چھوٹی عمر توں ہی لکھنا شروع کر دتا۔ پریتم ہوراں نے اپنی پہلی کتاب ۱۹۳۶ء وچ چھپوائی۔ ایہہ کتاب شاعری دی کتاب سی تے ایس ویلے آپ دی عمر صرف ۱۶ برس سی۔ ایس توں بعد آپ دی شاعری دا سفر رُکیا نہیں۔ نہ صرف شاعری بلکہ مختصر کہانیاں تے ناول نگاری وی آپ دی دل چسپی دا مرکز رہے۔

آپ دی سب توں مشہور نظم اَج آکھاں وارث شاہ نوں ہے۔ ایہہ نظم ۱۹۴۸ء وچ شایع ہوئی۔ ایس وچ مشہور پنجابی شاعر وارث شاہ نوں اواز دتّی گئی اے۔ وارث شاہ نے قصہ ہیر رانجھا نہایت خوب صورتی نال بیان کیتا سی۔ امرتا ہوراں نے ایس نظم وچ تقسیم ۱۹۴۷ء تے اوہدے عام لوکاں دی زندگی اُتّے اثرات بارے گل کیتی اے۔

امرتا پریتم ایسی پہلی خاتون سن جیہناں نوں بھارتی سرکار ولوں ''پدم شری'' ایوارڈ ملیا، جو کہ بڑا اُچا سویلین ایوارڈ اے۔ اک ادیب توں علاوہ آپ اِک سماجی کارکن وی سن۔ آپ نے اپنی زندگی وچ خواتین دے حقوق بارے کافی گل کیتی۔ ایس توں علاوہ آپ نے اِک ایڈیٹر تے صحافی دے طور تے وی کم کیتا۔ آپ نے مختلف اخباراں وچ وی فرائض انجام دتے۔ ایس توں علاوہ آپ نے اپنے ماہانہ میگزین دی وی ابتدا کیتی جیہدا

مقصد پنجابی ادب تے پنجابی ثقافت نوں فروغ دینا سی۔

آتم کتھا

امرتا جی نے اپنیاں کہانیاں وچ معاشی و معاشرتی مسائل بارے کافی گل کیتی اے۔ ایسی ہی مشہور کہانی ''آتم کتھا'' وی اے۔ ''آتم کتھا'' وچ امرتا جی نے اک نقشے بارے گل کیتی اے جو جذبات و احساسات دی صورت دلاں وچ وسدا اے۔ پر کوئی وی کردار ایس نقشے دا گھر نہیں بنا پاندا۔ اوہدی وجہ ایہہ ہوندی اے کہ ایس نقشے نوں عملی جامہ پہناون واسطے زمانے دے مکار اصولاں نال چلنا پیندا اے۔

ایس افسانے دی ابتدا اوسے نقشے دی بے بس حالت نال ہوندی اے، جس نوں کوئی قبول نہیں کردا۔ اوہ نقشہ اپنی آتم کتھا سناوندا اے کہ کس طرح اوہ کئی دلاں دا مکین بنیا، پر عملی جامہ نا پا سکیا۔ شروع وچ اوہ اک فوجی دے دل وچ ہوندا اے جو کہ لڑائیاں جھگڑیاں دی وجہ توں ہون والی جنگ وچ ماریا جاندا اے۔ کہانی دے اس حصے وچ امرتا جی نے جنگاں اتے تنقید کیتی اے۔ ایہہ تنقید واضح نہیں بلکہ چھپی ہوئی اے۔ کہ کس طرح اک فوجی دے دل وچ اک نقشہ ہوندا اے پر اوہ کدی منطقی انجام تک نہ پہنچ پایا۔

اوس توں بعد اوہ نقشہ کئی دلاں وچ وسن دے چارے کردا اے پر اوہناں لوکاں دی تنگ دستی تے بھیڑے حالات کر کے نہیں وس پاندا۔ اخیر اس نقشے نوں اک مسلمان بزرگ لبھدا اے۔ اوس بزرگ دا اک محنتی پتر وی ہوندا اے جو اپنی ساری تنخواہ اپنے پیو دے ہتھ اتے رکھدا اے۔ پر فیر شہر دے حالات خراب ہو گئے۔ سارے شہر وچ چاقو چھُریاں چلن لگ پئے۔ ایس ویلے اوس نقشے نوں مجبوراً اوس بزرگ دے دل وچوں نکلنا پیا۔ وجہ ایہہ سی کہ حالات خراب ہوون توں بعد بزرگ نوں اوہ علاقہ چھڈنا پیا۔ کہانی دے اس حصّے وچ امرتا جی نے مذہبی انتہا پسندی تے ہندو مسلم جھگڑیاں بارے گل کیتی اے کہ کس طرح ایہہ لڑائیاں سچے تے پیارے جذبات دیاں دشمن نیں۔

کہانی چلدی اوس نقشے نوں اک محنت کش کول لے جاندی اے پر اوہ محنت کش اس نقشے نوں اپنے دل وچوں ایہہ گل کہہ کہ کڈھ دیندا اے کہ ''میری عورت چھِن گئی، ایس دھرتی اتے میرا گھر نہیں وس سکدا۔'' آخر کار اوہ نقشہ اک پڑھے لکھے شخص دے دل وچ وسدا اے جس دی ماں نے اپنا سارا زیور وِیچ کے اپنے بچے نوں تعلیم دلوائی ہوندی اے۔ اوہ نوجوان بڑی غیرت والا ہوندا اے۔ جو ایہہ سوچ رکھدا اے کہ سرکار توں قرض لے کے اوہ اپنے پیو دی زمین اتے اک مکان بنائے گا۔ پر کئی مہینے گُزر جان توں بعد وی اوہدا نقشہ پاس نہیں ہوندا۔ وجہ اوہدے پچھے ایہہ ہوندی اے کہ اوہ نقشہ پاس کران واسطے رشوت نہیں دیندا۔ آخر اوہ نقشہ کدی پاس نہیں ہوندا۔ نقشے دیاں فائلاں نوں چوہے کترن لگ جاندے نیں۔ کہانی جتھوں شروع ہوندی اے اوسے موڑتے جا مکدی اے۔ ایس کہانی دا مقصد زمانے دے بے ایمان نظام بارے دساں سی، جو کہ امرتا جی نے بخوبی انجام دتا۔ امرتا جی نے ایہہ سمجھاون دی کوشش کیتی کہ بد قسمتی نال جے زمانے دے بد نظام نوں قبول نہ کیتا جائے تاں تہاڈا ایس دنیا وچ کوئی کم نہیں ہو پاندا۔ ایہہ کہانی امرتا پریتم جی نے ۱۹۷۶ء وچ لکھی۔

لُٹیا دی چھوکری

امرتا جی اک پڑھی لکھی خاتون سن تے آپ نے اپنی ساری زندگی خواتین دے حقوق بارے گل کیتی۔ ''لُٹیا دی چھوکری'' وی اوہناں کہانیاں وچوں اک اے، جو عورت دی ہمت، لگن تے پختہ ارادے بارے گل کردی اے۔ ایس کہانی دا اک مرکزی کردار دیس راج اے، جو اپنی بیوی نوں شادی دی پہلی رات ''چارو'' دی کہانی سناوندا اے۔ چارو اک مضبوط کڑی ہوندی اے جیہدی ماں نوں ظالم لوک کنویں وچ سٹ دیندے نیں تے چارو دا پیو ایس غم نال کملا ہو جاندا اے۔ دیس راج اپنی بیوی پاروتی نوں چارو بارے دسدا اے کہ کس طرح چارو اپنے ماں پیو دا بدلہ لیندی اے تے کس طرح چارو اپنے بدلے دی اگ اگے کسے شے نوں نہیں آون دیندی۔ دیس راج بیان کردا اے کہ چارو اپنی محبت نوں قربان کرن لئی تیار ہوندی اے۔ تے سنکی جو کہ چارو نال پیار کردا

اے، ایس نوں وی چار واس ویلے تک قبول نہیں کر دی جدوں تک اوہ اپنا بدلہ لین وچ سرخرو نہیں ہو ندی۔

ایس کہانی وچ امرتا جی عورت دے پختہ ارادے تے ہمت دا درس دین توں علاوہ ایہہ وی بیان کر رہے نیں کہ کیویں اک عورت نوں معاشرے وچ مشکلات دا سامنا کرنا پیندا اے۔

امرتا پریتم دی شاعری

افسانہ نگاری تے مضمون نگاری توں علاوہ امرتا جی نے شاعری وچ وی بڑا ناں کمایا۔ آپ دی شاعری وچ عشق تے ہجر دے بارے کافی جذبات ملدے نیں۔ آپ دیاں کچھ مشہور کتاباں وچ نویں رُت تے کاغذ تے کینوس شامل نیں۔ آپ نے اپنی شاعری وچ ظلم و جبر دے خلاف وی کافی گل کیتی اے۔ ایس توں علاوہ معاشی و معاشرتی مسائل خاص کر کے عورتاں دے بارے وی کافی شاعری ملدی اے۔ ہجر بارے گل کر دے ہوئیاں امرتا جی نے اک نہایت خوب صورت نظم لکھی جیہدا عنوان ''توں نہیں آیا'' اے۔

چیتر نے پاسا موڑیا
رنگاں دے میلے واسطے پھلاں نے ریشم جوڑیا
توں نہیں آیا۔۔۔
ہوئیاں دوپہراں لمیاں۔
داکھاں نوں لالی چھوہ گئی، راتاں نے کنکاں جمیاں
توں نہیں آیا۔۔۔

ایس توں علاوہ امرتا جی نے تنگ دستی تے جیون دیاں مشکلات بارے وی کافی لکھیا اے۔ ''خونی سویر'' وچ آپ لکھدے نیں:

اک زہر سی جو پی لیا، اک موت نوں اساں جی لیا
چھاتی چ اگ بلدی پئی، اکھاں چوں پانی ویہہ رہیا

نہ صرف امرتا جی نے ظلم و جبر تے عشق دے موضوعات بارے لکھیا بلکہ حب الوطنی تے وطن دیاں جذباتاں نوں وی کئی تھاویں اپنی شاعری دا موضوع بنایا۔ اگرچہ آپ مسلمان نہیں سن، آپ دی شاعری وچ سانوں مسلم عبادات ور سومات دا ذکر وی لبھدا اے۔ ایس گل تے غور کریے تے پتا لگدا اے کہ آپ نوں مسلم تہذیب دا کافی علم سی۔ آپ نے اپنی شاعری وچ وی ایہہ ثبوت دتا اے۔ ایس گل پچھے وجہ اک ایہہ وی ہو سکدی اے کہ آپ دا تقسیم توں پہلاں تعلق پاکستان نال سی۔ آپ دا کافی سماں مسلماناں نال لنگھیا۔ آپ لکھدے نیں:

اللہ! ایہہ کون آیا ہے
اج نظر وی حیران ہے
کہ میری راہ وچ ایہہ کیہو جیہا مقام آیا ہے!
اللہ! ایہہ کون آیا ہے
کہ تری جگہ زبان تے اج اوس دا نام آیا ہے!

مضمون نگاری

امرتا جی نے ہندی تے پنجابی وچ نہ صرف شاعری کیتی بلکہ افسانہ نگاری دے نال نال مضامین وی لکھے۔ آپ نے اپنی حیاتی وچ سو (۱۰۰) توں زیادہ افسانے لکھے۔ آپ نے ۱۹۴۷ء دی تقسیم بارے وی کئی مضامین لکھے۔ امرتا جی دے مشہور افسانیاں وچوں "تری میری اک جندڑی" تے "آتم کتھا" تے ہور شامل نیں۔ ایس توں علاوہ کجھ ہور افسانیاں وچ "آخری خط"، نیل کمل"، تہہ خانہ"، دو کھڑکیاں"، تجارت دا سوال" تے "لال مرچ" شامل نیں۔

آپ نے اپنی زندگی وچ اپنے کم دی وجہ توں بہت پزیرائی پائی۔ آپ نوں پوری دنیا وچ آپ دے ادب دی وجہ توں اِک نمایاں مقام حاصل اے۔ آپ نوں اپنی زندگی وچ نا صرف بہت سارے ایوارڈز ملے، جس وچ

''بھارتی گیان پیٹھ ایوارڈز'' وی شامل اے، بلکہ مختلف کالجاں تے یونیورسٹیاں ولوں اعزازی ڈگریاں تے خطاب وی ملے۔ آپ دے کم دا چونتی (۳۴) زباناں وچ ترجمہ کیتا گیا۔ آپ دی وفات ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء نوں دہلی وچ ہوئی مگر آپ دا کم اج وی زندہ اے۔

❋ ❋ ❋

راحم مظہر

ہیر دے کجھ قصّے (ترجمہ)

کشن سنگھ عارف، جیہدا ''ہیر تے رانجھے'' دا قصّہ اسی آغاز وچ تکیا اے، بڑا لاجواب اے۔ جیوں اُس دور دے کئی قصّہ کہن والے شاعراں دے قصّے نیں۔ اوہ امرتسر دے کول ۱۸۳۶ء وچ اک سکھ خاندان وچ پیدا ہوئے۔ کشن سنگھ اِک کتاباں وپچن والے دے پُتر سن جیہدی دکان امرتسر دے ''مائی سیون بازار'' وچ سی۔ سنگھ نے ایہہ رِیت اپنے والد دی وفات توں بعد سانبھی تے ایسے طرح اپنے ادبی عزائم دے نال نال اوہ اِک پبلشر (جو کہ اوس دور وچ اک کتاباں وپچن والے دا دستور سی) تے کتاب فروش بن گئے۔ اوہ گلاب داس دے شاگرد سن جو کہ گلاب داسی فرقے دے روحانی پیشوا سن۔ جیہدا اثر اوہناں دی تحریراں وچ ویکھیا جاسکدا اے۔ قلمی ناں عارف یا علمی (خاص طور تے خدا دی راہ)، کشن سنگھ نے گھٹ توں گھٹ ست قصّے لکھے نیں۔

فضل شاہ تے کشن سنگھ دے مقابلے مولا شاہ گھٹ وسائل (ذرائع) تے عاجزانہ پس منظر دے آدمی سن۔ اوہ ۱۸۶۷ء وچ امرتسر دی اک قصائی (پیشے دے لحاظ توں قصائی) برادری وچ پیدا ہوئے۔ اوہ ضلع گورداسپور وچ ودھے جتھے اوہناں نیں اِک بلا معاوضہ مزدور دے طور تے کم کیتا۔ اپنی نوعمری دے وچ اوہ اک مقامی ملّاں (مسلماناں دا مولوی) دے شاگرد بن گئے جیہناں نے شاہ نوں شروعاتی شکشا (تعلیم) دتّی۔ شروعاتی شکشا حاصل کرن توں بعد مولا شاہ امرتسر واپس آئے جتھے اوہ اک شاعر تے روحانی ادھیاپک دوویں بن گئے۔ جیویں مذہبی صفت سنت (مذہبی عقیدت مند) نے تجویز کیتا۔ جیہدے وچ اوہناں دا کلام چھپیا اے۔ سائیں مولا شاہ نے کافی، سی

حرفی، تے گھٹ توں گھٹ تن قصّے لکھے۔ اوہناں دا "ہیر ورانجھا" ۱۹۱۲ء وچ چھپیا۔

مولا شاہ دے مقابلے تے امیر حیدر شاہ نے جنوبی پنجاب دی اک شاہی ریاست بہاولپور دے نواب دے اک درباری دی حیثیت نال بڑی سعادت دی زندگی گزاری۔ نکی عمرے جتھے اوہ پہلوان بنے، اوس توں بعد اوہ نواب دی حکومت وچ آ گئے۔ جیہدی سیوا اوہناں نے ۱۸۶۶ء وچ چھڈی۔ حالاں کہ اوہ پنشن ساری عمر ای لیندے رہے۔ ۱۹۰۰ء وچ اپنی موت توں کجھ دیر پہلے اپنے قلمی ناں میر اں شاہ بہاولپوری دے ناں توں اوہناں نے قصّہ ہیر ۱۸۹۸ء-۱۸۹۹ء وچ چھپوایا۔

انہویں صدی دے اخیر تے ویہویں صدے دی شروعات وچ کئی دوجے شاعراں نیں پنجابی قصّے لکھے۔ اسیں اوہناں دیاں تحریراں توں علاوہ اوہناں دی زندگی بارے بہت گھٹ جاننے آں۔ سارے ای لمّے قصّیاں دے لکھاری ایہناں وچ شامل نیں۔ بھائی سَت بخارا سنگھ، قصّہ ہیر تے رانجھے دا (ہیر تے رانجھے دا قصّہ، امر تسر، ۱۸۹۴ء، ۱۹۵ صفحے)، لاہور اسنگھ (۱۸۶۵ء)، ہیر لاہوری (لاہوری دی ہیر، لاہور، ۱۹۳۱ء، ۱۹۵ صفحے)، کشور چاند، نواں قصّہ ہیر کشور چند (کشور چند دا نواں قصّہ ہیر، امر تسر، ۱۹۱۴ء، ۸۰ صفحے)، گوکل چند شرما بیسن والا، قصّہ ہیر گوکل چند (گوکل چند دا قصّہ ہیر، لدھیانہ، ن۔ د۔، ۱۵۶ صفحے)، فیروز دین شرف، ہیر سیال (لاہور، ۱۹۳۳ء، ۱۷۶ صفحے)، تے بھائی لقما سنگھ، قصّہ ہیر و میاں رانجھا، (ہیر تے میاں رانجھے دا قصّہ، پشاور ۱۸۷۶ء، ۱۰۰ صفحے)۔

❋ ❋ ❋

خدیجہ ارشد

ڈائری

چویہہ مارچ

اج چویہہ مارچ سی تے اج دا دن ہندوواں واسطے بڑی اہمیت تے خوشی دا دن ہوندا اے کیوں کہ اج دے دن اوہناں دا اک تہوار جیہنوں "ہولی" کہیا جاندا اے، منائی جاندی اے۔ میں اج صبح اٹھی تے جداں کہ رمضان المبارک دا مہینہ چل رہیا اے، اُٹھ کے سحری کیتی۔ سحری کرن توں بعد میں نماز پڑھی تے قرآن پاک دی تلاوت کیتی۔ اوس توں بعد میں باہر میدان وچ نکل گئی۔

سویر دا ویلا سی تے ہر پاسے پرندے چہچہا رہے سن۔ میں اک دو چکر گراؤنڈ دے لائے تے کچھ دیر ٹھنڈی ہوا دے مزے لے، فیر اپنے کمرے وچ واپس آ گئی۔ میں تیار ہو کے لائبریری واسطے نکلی۔ جدوں میں جا رہی سی تے مینوں یک دم اِک پاسیوں رولا جیہا سنائی دتا، تے میں ویکھن واسطے اوس پاسے ٹر پئی۔ اگے ویکھیا تے سارے اِک دوجے اُتے رنگ سٹ رہے سن۔ ہر پاسے رنگ رنگ ہویا پیا سی۔ لال، نیلا، ہرا، پیلا، ایس طرحاں بہت سارے رنگ اِک دوسرے دے مونہاں اُتے مل رہے سی تے اِک دوجے اُتے سٹ رہے سی۔ اوہ منظر ویکھ کے مینوں بڑا ہی چنگا لگیا۔ میرا دل کیتا کہ میں وی ہولی مناواں پر میرے ذہن وچ گل / خیال آیا کہ میں تے مسلمان آں، میں ایہدے وچ شامل نہیں ہو سکدی۔ فیر میں اوتھے بہہ کے کِناں چر اوہناں نوں تکدی رہی تے اوہناں ول ویکھ کے ای خوش ہوندی رہی۔ فیر میری اسلامیات دی کلاس دا ویلا وی ہو گیا تے میں اپنی کلاس وچ

چلی گئی۔ ساڈا اج موضوع ایسا سی کہ جیہدے وچ پروفیسر صاحب نے سانوں دسیا کہ سانوں ساریاں نوں اک دوجے دے مذہب دا احترام کرنا چاہیدا اے۔ پر ساڈے ملک وچ مسلماناں توں سوا دوسرے مذاہب نوں کم تر سمجھیا جاندا اے۔ لوک اوہناں نال ایداں روّیہ رکھدے نیں جداں کہ اوہ انسان ہی نہیں ہندے، بلکہ مسلماناں وچ وی فرقہ پرستی / فرقہ واریت آجاندی اے۔ ساڈی یونیورسٹی دے وچ مختلف مذہباں دے لوک موجود ہن تے اوہناں نوں برابر عزت دتی جاندی اے۔ پروفیسر صاحب نے دسیا کہ اِک دوجے دے مذہب نوں نفرت دی نگاہ نال نہیں ویکھنا چاہیدا۔ اوہنوں عزت دینی چاہی دی اے۔ فیر ایس توں مینوں بابا نجمی دا اوہ شعر یاد آیا جیہڑا اوہناں میری پنجابی دی کلاس وچ سنایا سی۔ بابا نجمی جیہناں دا اصل ناں 'بشیر حسین' اے، پنجابی زبان دے وڈے شاعر نیں۔ ایہناں دی شاعری موجودہ زندگی دیاں معاشرتی قدراں تے معاشی نظام دی پیدا کیتی تنگی دے خلاف احتجاج دی شاعری اے۔ شعر کجھ انج اے کہ:

مسجد میری توں کیوں ڈھانویں، میں کیوں ڈھانواں مندر نوں
آجا دونویں رل کے پڑھیے، اِک دوجے دے اندر نوں

کلاس توں بعد میں تے میری سہیلی کچھ ہندو دوستاں دے نال ملے تے اوہناں نال اسی وی ہولی منائی تے خوب مزا کیتا۔ فیر اودوں تک افطاری دا ویلا وی ہو گیا تے میں مسجد وچ چلی گئی۔ اوتھے افطاری کیتی تے مغرب دی نماز ادا کیتی فیر اپنے کمرے وچ آ گئی۔ کجھ دیر ڈرامہ ویکھیا تے فیر عشا دی نماز ادا کر کے سو گئی۔ ایس طرحاں دن دا اختتام ہو گیا۔

پنجھی مارچ

اج دا دن بڑا ہی یادگار گُزریا۔ اج وی میں ہمیشہ دی طرحاں سویرے اٹھی تے نماز ادا کیتی تے قرآن پاک پڑھیا۔ فیر میں ناشتہ کیتا تے اج میں بازار وی گئی کیوں کہ میں کجھ ضرورت دیاں چیزاں اپنے واسطے لینیاں

سی۔ میں پہلے بازار گئی تے اوتھے بہت لوک آئے ہوئے سی۔ طرحاں طرحاں دے لوک، بچے، وڈے سب اپنے واسطے خریداری کر رہے سی کیوں کہ اگے عید وی آرہی اے۔ بہت ساریاں کڑیاں اپنے واسطے ونگاں خرید رہیاں سی، جھمکے خرید رہیاں سی تے کوئی مہندی دے رنگ ویکھ رہیاں سی۔ مینوں وی جھمکے ودھیا لگے تے میں اوہ خرید لئے۔ فیر میں اپنیاں استعمال والیاں چیزاں خریدیاں تے اوتھے بازار وچ مینوں اک کتاباں داسٹال نظر آیا۔ ویسے عام طور تے میں بازار وچ کدی ویکھیا نہیں پہلے، تے میں تھوڑا حیران ہوئی تے چنگا وی لگا ویکھ کے تاں ایہہ سوچ کے، کہ لوک پڑھن داشوق رکھدے نیں۔ میں گئی تے کتاباں ویکھیاں۔ بہت ساریاں کتاباں سی، ہر زبان دیاں کتاباں موجود سن۔ پنجابی، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ، سب۔ میرا دل کیتا کہ اک کتاب خرید لواں کیوں کہ مینوں اوہ بہت زیادہ سوہنی لگی۔ پر اودوں میرے کول پیسے ختم ہو گئے سی۔ تے فیر میں اپنی یونیورسٹی ول دارُخ کیتا۔ جدوں میں واپس آرہی سی تے میں اِک پارک وچ بچیاں نوں کرکٹ کھیڈدے ہوئیاں ویکھیا۔ اوہ بچے اپنی ہی مستی وچ مصروف سی۔ اوہناں نوں کسے چیز دی کوئی فکر نہیں سی۔ تے مینوں اوہناں ول ویکھ کے اپنا بچپن یاد آگیا کہ کداں میں اپنے بچپن وچ کھیڈدی ہندی سی۔ جدوں گرمیاں دیاں چھٹیاں ہندیاں سی تے میرے تایاجی سانوں لین واسطے آجاندے سی تے اساں اوہناں دے نال پنڈ چلے جائی داسی۔ تے پنڈ وچ اسیں کھیتاں وچ کھیڈی داسی۔ درختاں توں کچے امب توڑ توڑ کے کھائی دے سی، تے کھالیاں دے وچ نہائی داہندا سی۔ گلّی ڈنڈا کھیڈی داسی، باندر کلّا وی سارے رل کے رات نوں منھ ہنیرے کھیڈی داسی۔ پٹھو گرم، رسّی ٹپنا سب کجھ سارے رل کے کھیڈدے سی۔ صرف بچے ہی نہیں اوہناں دے نال نال وڈے وی کھیڈدے سی۔ تے پنڈاں وچ سارے رل مل کے رہندے سی۔ کوئی کسے دے گھروں لسّی لین چلا گیا تے کوئی کسے دے گھروں مکھن۔ کسے نوں اپنے گھر دا بنیا کھانا پسند نہیں آوندا سی تے اوہ کسے وی گھروں جا کے کھا لیندا سی، کوئی منع نہیں سی کردا۔ اج کل اوہو جیہا کجھ وی نہیں رہ گیا۔ سب کجھ بدل گیا اے۔ اک دوجے دے نال کوئی رابطہ نہیں رہ گیا۔ اج کل تے ''پرائیویسی'' دے ناں تے سب وکھو وکھ ہو گئے نیں۔ تے اوہ بچپن ورگی زندگی وی نہیں رہ گئی۔

جداں ہی انسان وڈا ہندا اے تے زندگی دیاں مصروفیتاں وچ رُجھیا رہ جاندا اے تے کسے نوں کسے دی کوئی پروا نہیں ہندی۔ آپس وچ کوئی تعلق نہیں رہ جاندا۔ انسان تے دنیادی مال و دولت حاصل کرن پچھے ایناں پاگل ہو گیا اے کہ اپنے رب تک نوں وی بھُل گیا اے۔ اوہنوں لگدا اے کہ ایہہ دنیا غیر فانی اے تے اوہنے ہمیشہ ہی ایتھے ای رہنا اے۔ ایس توں مینوں گرداس مان دا گانا یاد آ گیا جو کہ کجھ ایداں اے کہ:

بچپن چلا گیا تے جوانی چلی گئی
زندگی دی قیمتی نشانی چلی گئی

ایہہ سب سوچدیاں سوچدیاں میں اپنی یونیورسٹی پہنچ گئی تے فیر افطاری کیتی تے مغرب دی نماز ادا کیتی تے میدان دی ٹھنڈی ہوا لین ٹر پئی۔ اوتھے بچے فٹ بال کھیڈ رہے سی تے میں وی اوہناں نال رل کے فٹ بال کھیڈیا۔ پھیر میں تھکی ہاری اپنے کمرے وچ واپس آئی۔ حالے میر اپڑھنے والا کم وی پیا سی پر میں سوچیا کہ صبح اٹھ کے پڑھاں گی۔ غسل کیتا تے فیر میں سو گئی۔

چھبی مارچ

اج دا دن میر ابڑا ہی مایوسی دا سی۔ اج میں سویرے اٹھی تے فجر دی نماز ادا کیتی تے قرآن پاک پڑھیا۔ ایس توں بعد میں پی۔ ڈی۔ سی وچ ناشتہ کیتا تے اپنے 'Sociology' دے امتحان واسطے تیاری کرن لگ پئی۔ دو وجے میری کلاس دا ویلا وی ہو گیا تے میں کلاس لین چلی گئی۔ کلاس وچ ساڈی پروفیسر نے ساڈے مڈ ٹرم دتّے۔ جیہدے وچ میرے نمبر گھٹ آئے۔ میں زیادہ / بہتیاں نمبراں دی امید کیتی بیٹھی سی۔ جدوں میں پروفیسر کول گئی تے اوہناں مینوں آکھیا کہ توں زیادہ تفصیل نال نہیں لکھیا۔ فیر مینوں محسوس ہویا کہ کاش اج مینوں وی انگریزی زبان آوندی ہندی تے میں وی اپنے خیالات نوں لفظاں وچ انج ہی بدل سکدی جداں کہ میں اردو یا پنجابی زبان وچ بدل سکدی آں۔ میں جیہڑے سکولوں تعلیم حاصل کیتی اوتھے سانوں انگریزی سکھائی ہی نہیں

گئی۔ میں اردو وچ ہی تعلیم حاصل کیتی کیوں کہ میرے ابو جی اِک مزدور نیں تے اوہ میری پڑھائی دا خرچہ نہیں چُک سکدے۔ ایس واسطے میں اِک بورڈنگ سکول توں تعلیم حاصل کیتی۔ جے اسی وی امیر ہندے تے ساڈے کول وی اینے پیسے ہندے کہ اسی وی چنگی تھاں توں تعلیم حاصل کر دے جداں کہ امیر اپنے بچیاں نوں چنگے سکولاں توں پڑھاندے نیں۔ جتھے انگریزی وچ ہی گل بات کیتی جاندی اے بلکہ اوہناں دے تاں گھر وچ وی انگریزی ہی بولی جاندی اے۔

افسوس ایس گل دا اے کہ ساڈے ملک وچ اپنی زبان نون چھڈ کے انگریزی زبان نوں ترجیح دتی جاندی اے۔ اوہ ملک کدے وی ترقی نہیں کر دا جیہڑا اپنی زبان تے ثقافت نوں پچھے چھڈ دیوے۔ ہن جے اساں چین ول ویکھیے تے اوہ اپنی ہی زبان نوں اہمیت دیندا اے تے اج اوہ دنیا دے ترقی یافتہ ملکاں وچ گنیا جاندا اے۔ ایس دے برعکس اسی پاکستانی، اپنی ہی ثقافت نوں بھُل بیٹھے آں تے اپنی زبان بولن وچ شرم محسوس کر دے آں۔ حالاں کہ سانوں اپنی زبان تے فخر ہونا چاہیدا اے۔

ایس توں بعد میری پنجابی دی کلاس سی تے ساڈے پروفیسر نے سانوں زبان دی اہمیت بارے دسیا کہ مادری زبان بہت اہمیت رکھدی اے۔ اساں ایس بارے کجھ مضمون وی پڑھے جیہناں وچوں اِک ساڈی ہی یونیورسٹی دے پروفیسر نے لکھیا اے۔ اوہدے وچ اوہناں ذکر کیتا کہ جدوں اسّی فیصد توں ودھ آبادی پنجابی بولدی اے تے ایہنوں سکولاں وچ کیوں نافذ نہیں کیتا جاندا؟ کیوں ایہدے وچ تعلیم نہیں دتی جاندی؟ تے فیر اوہناں ذکر کیتا کہ پہلے وقتاں وچ جیہڑے علاقے وچ جو زبان بولی جاندی سی، اوسے وچ ہی تعلیم دتی جاندی سی، ایس نال بچہ ذہنی طور تے ترقی کر دا سی، کیوں کہ اوہنوں دوسری زبان سکھن واسطے کسے قسم دی مشکل دا سامنا نہیں کرنا پیندا سی (جداں کہ مینوں کرنا پیا)۔ میں جدوں تک اپنے سکول وچ پڑھدی سی جیہدے وچ اردو نوں اہمیت دتّی جاندی سی اودوں تک میں بڑے چنگے نمبر حاصل کر دی رہی۔ میں اپنی کلاس دی ٹاپر 'Topper' ہندی سی۔

پر جدوں میں لمز یونیورسٹی وچ آئی جو کہ اِک ایلیٹ کلاس یونیورسٹی اے، اودوں میں سب کجھ کھو بیٹھی۔ کیوں کہ ایتھے میرا مقابلہ اوہناں بچیاں نال ہویا، جیہناں دی مادری زبان ہی انگریزی سی، جیہڑی مینوں آوندی وی نہیں سی۔ ایس کر کے مینوں بہت مشکلاں دا سامنا کرنا پیا تے میں اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھی۔ پہلے سمیسٹر وچ میرے بہت گھٹ نمبر آئے تے مینوں وارننگ ملی کہ مینوں ایس یونیورسٹی وچوں کڈھ دتا جاوے گا۔ میں اپنے ماں باپ دا خواب پورا کرن لئی اج وی اپنی محنت تے جدوجہد کر رہی آں جداں کہ میں اِک جنگ لڑ رہی ہووا۔ پر ایہہ سب کجھ میں کسی نوں دس نہیں سکدی، تے جے دس وی دیواں گی تے اوہ محسوس نہیں کر سکے گا، کیوں کہ اوہنے کدی ایس چیز دا سامنا نہیں کیتا ہووے گا۔ میری وی مجبوری اے کیوں کہ میں ایس دنیا دی دوڑ وچ رکنا نہیں چاہوندی۔ مینوں انگریزی زبان بارے انور مسعود دا اِک شعر یاد آ گیا جو کجھ انج اے:

پھک بیٹھے آں پھکی کیہڑی
پڑھ پڑھ کے اساں انگریزی، کر لئی آ ترقی کیہڑی

جدوں وی میں ایہناں گلّاں بارے سوچدی آں تے میریاں اکھیّاں وچ اتھرو آ جاندے نیں۔

عائزہ شجاع

ڈائری

ایت وار-۲۴ مارچ ۲۰۲۴ء

پیاری ڈائری۔

اج دا دن روحانی کھوج تے غیر متوقع دریافتاں نال بھریا ہویا سی۔ جیویں لاہور دے پُرانے شہر تے سورج چڑھیا، میں اِک کورس پراجیکٹ لئی تن مِتّراں نال مادھولال حسین دے تاریخی مزار تے اپڑی۔ مزار دا سفر اپنے تیئں اِک مہم جوئی سی۔ پرانے شہر دیاں تنگ گلیاں وچوں لنگھنا اوکھا کم سی، جیہدے واسطے سانوں اپنی گڈی کھلار کے رکشے وچ جانا پیا۔ عطراں دی خشبوواں تے موسیقی دے سُر سانوں اپنے رستے دا پتا دس رہے سی۔

مزار تے گہما گہمی سی، تے ہر قسم دے لوک صوفی بُزرگ نوں سلام کرن دے واسطے آئے سی۔ ساری خلقت دے چہرے تعظیم تے عقیدت نال چمک رہے سی۔ میں وی اپنے آپ نوں ایس ماحول وچ گم ہوندا محسوس کیتا۔ اِس مقدس جگہ دے نظاریاں تے آوازاں وچ اِک جادو سی جیہدے وچ اساں سب گواچ گئے۔

جدوں میں مزار دے ویہڑے وچ چکّر لا رہی سی تے میں اپنے آپ نوں اِک دم پُرسکون محسوس کیتا۔ انج لگ رہیا سی کہ مزار دی دیواراں سانوں ماضی دے اوہناں بزرگاں دے قصّے تے کہانیاں سُنا رہیاں نیں جو میرے توں پہلے ایس پاک زمین تے ٹر آئے سی۔ اسیں مزار دے ہر کونے نوں ویکھن واسطے گھنٹے لگا دتّے۔ دیواراں تے سجن والی خطاطی توں لے کے ہر شے اپنی اِک وکھری کہانی سُنا رہی سی۔

فیر دربار وچ سانوں اِک فقیر ملیا۔ جس نے سانوں مادھولال حسین دی اِک مشہور کافی سنائی جیہدے وچ عشقِ حقیقی، محبت، روحانیت تے روح دی وحدت دا ذکر سی۔ اوہنوں سن کے ساڈے دل حیرت تے سکون نال بھر گئے۔ جدوں سورج ڈُبن لگا تے سانوں وی سمجھ آ گئی کہ ساڈے جان دا ویلا آ گیا اے۔ اسیں ساریاں نوں رب راکھا آکھیا تے گھر نوں ونجے۔ اچھا ہُن کل گل کراں گے۔

سوں وار–۲۵ مارچ ۲۰۲۴ء

پیاری ڈائری۔

اج دن دا آغاز خوش گوار ملاقاتاں تے پُرانیاں یاداں نال کیتا۔ یونیورسٹی دی ہل چل وچ قدم رکھدے ہی دو جانن پچھانن والے لوکاں نے میرا استقبال کیتا۔ اوہ میرے پُرانے متر سی جیہڑے سالاں بعد مینوں ملن آئے سن۔

دن دی شروعات تے اساں پرانے سکول وچ کیتی، جتھے اسیں ہالاں وچ گھمدے گھماندے تے بہت شرارتاں کردے سی۔ پتا ہی نہیں چلیا ویلا انج بیت گیا۔ بعد وچ اسی سکول دے کول موجود پارک وچ آ بیٹھے جتھے بچپن وچ اسیں کرکٹ کھیلدے سی۔ ایتھے اسیں خوب گلاں باتاں کیتیاں۔ جدوں تھک گئے تے اپنے خاص کارنر کیفے توں جا کے سموسے تے گرما گرم چاہ پیتی۔ چاہ دے دوران اسیں اپنے جماعت دے متراں نال کیتے گئے مذاقاں نوں یاد کر کے بڑا ہسے۔ فیر اپنے استاداں دی کہانیاں وی اِک دوجے نوں سنائیاں۔

جدوں ساڈی پیٹ پوجا ختم ہوئی تے اسیں اپنے پرانے محلے دا چکّر لاون نکل کھڑے ہوئے جتھے اسیں وڈے ہوئے سی۔ اوتھے اسیں خاص طور تے اوس درخت تک گئے جتھے اساں متراں دے ناں کڈھے ہوئے سی۔ فیر سانوں اپنیاں ساریاں پُرانیاں حرکتاں یاد آ گئیاں۔ اسیں آئس کریم ٹرک دا پچھا کر دے کر دے اوہ

شور کر دے کہ پورا محلہ جاگ جاندا تے سانوں بُرا بھلا آکھدا۔ ایس سب ہنسی مذاق دے وچ سانوں اِک احساس وی ہو رہیا سی کہ جاندا ویلا فیر دوبارہ ہتھ نہیں آندا۔ ایتھے اسیں جناں وی ماضی نوں یاد کر لیے، اوہ ویلا ہن واپس نہیں آوے گا۔ پر ایہہ دن بہت خاص سی کیوں کہ اسیں فیر پرانیاں یاداں دے وچکار آ گئے سی تے ایس دن نے سانوں پرانے دن یاد کرا دتے سی، جو اساں دا قیمتی سرمایہ اے۔ سورج ڈُبن ویلے اسیں واپس یونیورسٹی اپڑے۔ میں اپنے متراں نوں رب راکھا آکھیا تے واپس اپنے ہوسٹل لوٹ آئی۔ اچھا ہُن کل گل کراں گے۔

منگل وار-۲۶ مارچ ۲۰۲۴ء

پیاری ڈائری۔

اج دا دن بہت زیادہ رُجھیا سی۔ یونیورسٹی وچ کلاساں، لیکچر تے اسائنمنٹاں بناؤندے ہویاں لنگھ گیا۔ سون دا ویلا وی نہیں ملیا۔ پر اج سبھ کماں وچ اِک سکون دا پہلو وی سی۔ شام نوں اِک سہیلی نے افطار پارٹی دا سنیہا دتا سی۔ ہوسٹل آون دے بعد میں کجھ ٹائم آرام کیتا۔ فیر جیویں مغرب دا ویلا نیڑے آیا، میں تیار ہو کے اپنے مِتّراں کول اپڑ پئی۔ اسیں مل کے پارٹی دین والی سہیلی دے گھر اپڑے۔ افطار پارٹی بہت مزے دی سی۔ دستر خوان سوادی تے انوکھے پکواناں نال بھریا پیا سی۔ سموسے تے پکوڑے، دُدھ، دہی، لسّی، سوّیاں وغیرہ، غرض ہر شے پچھلی نالوں ودھ لبھاون والی سی۔

کھانے نالوں ودھ کے سبھ سہیلیاں دا اِک تھاں مل بیٹھنا زیادہ سوادی سی۔ یونیورسٹی وچ اِک دوجے نال ذرا گھٹ ہی گلّاں ہوندیاں سی۔ ایتھے اسیں کھلّے ڈُلھے زندگی دے ہر بکھیڑے اُتے گلّاں باتاں کر رہے سی تے ہنسی مذاق وچ رجھ گئے سی۔ ایہہ ملاپ ساڈا ایسا سی جیہا آخری ہووے۔ جیویں ہی رات پے گئی تے اسمان تے ہنیرا ہو گیا، میں اپنے اوپر سکون دا احساس محسوس کیتا۔ جیون دی رُجھاں دے وچکار ایس طرح دے پلان نے

ہولی ہون تے زندگی دی سادہ خوشیاں دے شکر ادا کرن دی اہمیت سکھائی۔

فیر جدوں میں گھر نوں ونجی، میں جاندی سی کہ ایس شام دیاں یاداں سدا میرے نال رہن گئیاں۔ اج مینوں سچ مچ بہت مزا آیا۔ اچھا ہُن پھیر گل کراں گے۔ ربّ راکھا۔

❋ ❋ ❋

فارسی

زمرن ڈیوڈ

خط های نوشتاری قدیمی از تاریخِ ایران

ایران کشوری با قدمت هزاران ساله است، که از آغازِ تمدن آغاز شده است. این مقاله در مورد خط های نوشتاری قدیمی است که در طول تاریخ در ایران استفاده می شدند.

در حالِ حاضر فارسی با خطِ عربی نوشته می شود۔ این خط در قرن هفتم میلادی با حمله اعراب و گسترشِ اسلام در ایران معرفی شد۔ پنج حرفِ جدید به خطِ عربی اضافه شد تا با زبانِ فارسی سازگار شود۔ این حروف پ، چ، ژ، گ، و ڤ هستند۔ حرف ڤ در حالِ حاضر در زبان فارسی استفاده نمی شوند۔

ولی پیش از آن خط های نوشتاری قدیمی بسیاری در ایران استفاده می شوند۔ فارسی ابتدا با 'Cuneiform Script' نوشته شد۔ Cuneiform را در فارسی خطِ میخی می گویند زیرا با میخ نوشته می شده است دهم به شکل میخ بودند۔ این خط در قرن پنجم قبل از میلاد با پادشاهِ هَخَامنشی در ایران معرفی شد۔

پس از فتحِ میانرودان (Mesopotamia)، زبانِ آرامی زبانِ رسمیِ ایران تا زمانِ حکومتِ ساسانی شد۔ ولی پس از آن خط های پهلوی برای بسیاری از فارسی قدیمی و سایر زبان های ایرانی از خطِ آرامی ساخته شد۔

خطِ اوستی یکی از انواع خط های پهلوی است۔ زبانِ اوستی بسیار قدیمی است و این زبان مهمترین زبان ایرانی برای دینِ زرتشت است. این خطِ قدیمی هنوز در حالِ حاضر استفاده می شود۔

اُردو ترجمہ اور وضاحت:

ایران ایک ایسا قدیم منطقہ ہے جس کی انسانی اور ثقافتی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اِس ملک کی تاریخ ایک ایسی قوت ہے جو انسانی تہذیب کے ساتھ اپنے اندر بسنے والے لوگوں کو اپنی تاریخ لکھنے پر مائل کرتی ہے۔ یہ مضمون اُن رسم الخط پر ہے جن کا استعمال ایران کی تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔

موجودہ دور میں فارسی زبان عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ یہ رسم الخط ایران میں ساتویں صدی عیسوی میں عرب حملوں کے بعد سے استعمال ہونا شروع ہوا۔ ایران میں عرب حکومت کے دوران اسلام پھیلنا شروع ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عربی زبان کو پڑھنے اور سمجھنے کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ یہ رسم الخط، جس کو ہم آج فارسی کے ساتھ منسلک کرتے ہیں، بے شک اِس کا حقیقی خط نہیں لیکن واقفیت کے بعد اہلِ فارس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنایا۔ ایران کے معروف شاعر جلال الدین محمّد رومی، ابوالقاسم فردوسی طوسی، اور خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی نے اسی خط میں اپنی کتب تالیف کیں۔ خطِ عربی کو فارسی کے ساتھ ہموار کرنے کے لئے اس میں پانچ نئے حروف کا اضافہ کیا گیا۔ یہ حروف پ، چ، ژ، گ، اور ڤ ہیں۔ ان میں سے حرف ڤ اب جدید فارسی میں استعمال نہیں ہوتا لیکن دیگر ایرانی زبان، جیسے کُردی زبان، میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن اس خطے میں اسلام سے پہلے کی ایک وسیع اور متنوّع ثقافت ہے اور اُس کی منفرد شناخت بے شمار قدیمی رسم الخط کی عکاس ہے۔ فارسی زبان کو سب سے پہلے 'Cuneiform Script' میں لکھا گیا تھا۔ اس رسم الخط کو ایران میں خطِ میخی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کو بذریعہ کیل پتھر پر تراشا جاتا تھا۔ یہ ایک قدیم رسم الخط ہے جسے ایران میں پانچویں صدی قبل از مسیح میں ھَخَا منشی حکومت کے ایک بادشاہ داریوش لایا تھا۔ اِس دور کے بعد جب ایرانی حکومت نے میانرودان (Mesopotamia) کو فتح کیا تو اُس خطے کی زبان آرامی کو اپنی

سلطنت کی سرکاری زبان قرار دیا۔ آرامی اِس سطح پر ساسانی حکومت کے زمانے تک رہی لیکن اپنی معدومیت کے باوجود ایرانی زبانوں کے لئے پھلوی رسم الخط کی صورت میں ایک میراث چھوڑ گئی۔ وقت کے ساتھ پھلوی رسم الخط کی بہت سی قسمیں بننے لگیں کیوں کہ اسے ایران میں بولی جانے والے زبانوں نے اپنی لکھائی کے لیے اپنایا۔ انہی میں سے ایک رسم الخط اوستی ہے۔ اوستی بذاتِ خود ایک قدیم زبان ہے جو اپنے لفظوں میں ہزاروں سالوں کی تاریخ سموئے ہوئے ہے، لیکن یہ زبان دینِ زرتشت کی پاک زبان مانی جانے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہی قدیم اوستی رسم الخط آج تک قائم ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔

بے شک آج کے دور میں تقریباً کوئی بھی قدیم ایرانی رسم الخط مروّج نہیں، لیکن ہمیں اِن قدیم آثار سے تاریخ کے بارے میں ملنے والے سبق اور حکمت کو کبھی بھولنا نہیں چاہئے۔

❋ ❋ ❋

اقصیٰ مشرف

سعدی کی نظم ’بنی آدم‘ کا تفصیلی مطالعہ

نظم:

بنی آدم اعضای یک دیگرند
که در آفرینش ز یک گوهرند

چو عضوی به درد آورد روزگار
دگر عضوها را نماند قرار

تو کز محنتِ دیگران بی غمی
نشاید که نامت نهند آدمی

ترجمہ:

بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں
جو ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں

جب حالات ایک اعضاء کو دُکھ پہنچاتے ہیں
تو باقی اعضاء آرام سے نہیں رہ سکتے

تم، جو دوسروں کے درد کو محسوس نہیں کرتے
انسان کہلانے کے لائق نہیں ہو

تبصرہ:

''بنی آدم''یعنی ''آدم کی اولاد''مشہور ایرانی شاعر سعدی شیرازی کی ایک لازوال نظم ہے جو سعدی نے اپنی کتاب گلستان میں لکھی ہے۔ یہ نظم انسانی اتحاد اور ہمدردی کی روح کو بہت عمدگی سے بیان کرتی ہے۔ چند ہی سطور میں، سعدی ایک آفاقی حقیقت کا اظہار کرتا ہے جو ثقافتوں، مذاہب اور زمانوں سے ماورا ہے؛ یعنی انسانیت کی فطری یکجہتی۔ اگرچہ یہ نظم صدیوں پہلے لکھی گئی تھی، اس کا پیغام آج کے دور میں بھی بہت گہرے اثرات رکھتا ہے۔ یہ نظم ہمیں یہ بات باور کراتی ہے کہ انسانیت کے یہ اصول ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہیں، جنھیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

اس نظم کی شروعات اس قوی شعر سے ہوتی ہے: بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں، جو ایک ہی جان سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ تمام انسان، چاہے وہ کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں، برابر ہیں۔ سعدی نے انسانیت کو ایک انسانی جسم سے تشبیہ دی ہے، جہاں ہر شخص اس جسم کے ایک حصّے کی طرح ہے۔ جیسے جسم کے تمام اعضاء مل کر ہم آہنگی سے کام کرتے ہیں، اسی طرح انسانوں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ متحد رہنا چاہیے۔ بنی آدم کی حقیقت ایک ہے، ہم ایک باپ کی اولاد ہیں، اور ہم ایک دوسرے کا حصّہ ہیں۔ ہماری بنیاد ایک ہے، اور ہماری تخلیق بھی ایک ہی ہے۔ ہمارا اصل ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم یک جا رہیں اور اپنے ہر 'حصّے' کی حفاظت کریں۔

اگلے شعر میں، سعدی بہت خوب صورتی سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح ایک فرد کا درد اور تکلیف پوری قوم کو متاثر کرتی ہے۔ یہ الفاظ موجودہ دور میں سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ آج ہم اپنی بہنوں اور بھائیوں کو فلسطین میں ناحق قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس سرزمین پر نسل کشی (genocide) کی جارہی ہے، بچے مارے جارہے ہیں، مظلوم انسانوں پر ناقابلِ تصوّر ظلم ڈھائے جارہے ہیں۔ ایسے میں تمام دنیا ایک خاموش

تماشائی بنی ہوئی ہے اور ان کے مصائب کو نظر انداز کر رہی ہے۔ سعدی کے یہ الفاظ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ایسے وقتوں میں ہم بے حس نہیں رہ سکتے۔ ہماری انسانیت ہم سے یہ توقع رکھتی ہے کہ ہم ہمدردی اور حمایت کے ساتھ پیش آئیں، بالکل اسی طرح جیسے جب جسم کا کوئی حصّہ زخمی ہو، تو پُورا جسم خود بہ خود اس کے علاج کے لیے فعال ہو جاتا ہے۔

سعدی اپنی نظم کو ایک مضبوط پیغام کے ساتھ ختم کرتا ہے جو ہماری اخلاقیات اور عقائد کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ایک عمل کی پکار ہے، جو ہمیں رحم دلی کو قبول کرنے اور اپنی ذاتی ذمہ داری کی یاد رکھنے پر زور دیتا ہے۔ سعدی کے مطابق اصل انسانیت ہماری اس صلاحیت سے واضح ہوتی ہے کہ ہم کس حد تک دوسروں کے درد کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سعدی کی یہ نظم انسانیت کے وجودی اتحاد کی اہمیت کو بہت سلیقے سے بیان کرتی ہے اور ہمیں یہ بات باور کراتی ہے کہ ہم سب 'ایک' ہیں اور یہ برادری ہماری شناخت ہے۔

❋ ❋ ❋

محمد هریره

عشق مادر

در يك روز گرم تابستان، پسر كوچكي با عجله لباسهايش را بيرون آورد و به داخل درياچه رفت۔ مادرش از پنجره به او نگاه مي‌كرد. مادر ناگهان تمساحي را ديد كه به سمت پسرش شنا مي‌كرد۔ مادر با عجله به سمت درياچه دويد و با فرياد پسرش را صدا زد۔ ولي دير شده بود۔

تمساح پاهاي كودك را گرفت،مادر هم رسيد و بازوي پسرش۔ مادر باعشق مادری بچه را گرفت ولی گرفت مادر آنقدر محكم بود۔

اجازه نمي داد پسر را با خود ببرد۔ در همان لحظه كشاورزي آنها را ديد و به كمك آنها رفت۔ و با چوبي‌كه داشت تمساح را دور كرد۔

پسر را به بيمارستان بردند۔ روي پاهاي پسر جاي دندان‌هاي۔تمساح بود و روي بازويش جاي ناخن هاي مادرش۔ خبرنگاري كه با كودك مصاحبه مي‌كرد از او خواست تا جاي زخم هايش را به او نشان دهد۔ پسر پاهايش را نشان داد و با ناراحتي گفت: ’’اين جاي دندان تمساح است‘‘۔ سپس با غرور بازو هايش را نشان داد و گفت: ’’اما اين زخم ها را دوست دارم، اين زخم های عشق مادرم هستند‘‘۔

عشق مادر (اردو ترجمہ)

گرمی کے موسم میں ایک دن، ایک چھوٹا بچّہ جلدی سے اپنے کپڑے لے کر باہر آیا اور جھیل کی طرف گیا۔ اسکی ماں نے اسکو کھڑکی سے دیکھا۔ ماں نے اچانک سے مگرمچھ کو دیکھا جو اسکے بچے کی طرف تیر کے جا رہا تھا۔ ماں جلدی سے جھیل کی طرف دوڑی اور اپنے بچے کو اونچی سی آواز دی۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔

مگرمچھ نے چھوٹے بچے کے پیروں کو پکڑ لیا۔ ماں بھی اُدھر پہنچ گئی اور اپنے بیٹے کو اسکے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ مگرمچھ نے اسکو زور سے کھینچا لیکن ماں کی محبت اتنی شدید تھی کے اسکو اجازت نہ دی کے وہ اسکے بچے کو اپنے ساتھ لے جائے۔ اسی وقت ایک کسان نے ان کو دیکھا اور ان کی مدد کرنے کیلئے بھاگا۔ اُس نے اَپنی چھڑی کے ساتھ مگرمچھ کو دور کر دیا۔

پھر وہ بچے کو ہسپتال لے گئے۔ اسکے پیروں پر مگرمچھ کے دانتوں کے نشان تھے اور اسکے بازوؤں پر اسکی ماں کے ناخنوں کے نشان تھے۔ ایک صحافی نے بچے کا انٹرویو کیا اور اپنے زخموں کے نشان دکھانے کو بولا۔ بچے نے اس کو اپنے پاؤں کے نشان دکھائے اور ناخوش ہو کر بولا: ”یہ مگرمچھ کے دانتوں کے نشان ہیں“۔ اس کے بعد اُس نے اپنے بازوؤں کے نشان فخر سے دکھائے اور بولا: ”لیکن یہ زخم مجھے بہت عزیز ہیں۔ یہ میری ماں کے محبت کے زخم ہیں“۔

پشتو

شاه محمود خان

د ډاکټر طارق محمود دانش ’فن او شخصیت‘

د بنو د ادب په ځوانانو لیکوالانو کښې یو هغه ځوان لیکوال هم دے چې د پېژندګلو هېڅ محتاج نۀ دے۔ نو هغه پیاوړے ځوان سوات دے که دیر دے، ملاکنډ که صوابي ده، چارسده که پېښور دے، بونېر دے که کوہټه او که لوئے کور افغانستان دے۔ الله پاک لوئے شهرت او پېژندګلو ورکړې ده۔ چې کله هم د بنو د لیکوالانو ذکر کېږي نو د دوئي د نوم نه بغېر به نیمګړے وي۔

مړه دانش یادوُم!، هو! د بنو دانش چې خپل نوم يې طارق محمود دے او ادبي نوم يې ځان د پاره دانش خوښ کړے دے۔ د پلار محترم نوم يې میرشهباز خان دے۔ او دې نړۍ ته يې د راتلو نېټه ٤ اپرېل ١٩٧٥ء یادوُل کېږي په خټه پښتون دے او د بنو لوئے ښار جنوب اړخ ته د ککشي خېل منډان سره تعلق لري۔ د زېږېدو ځائے يې لاهور دے۔ د دۀ پلار محترم د فوجي نوکرۍ په لړ کښې د مُلک په مختلفو سیمو کښې لکه لاهور، پېښور، کوہټه او په اخره کښې د بنو چهاوڼۍ کښې هم پاتې شوے دے۔ د پلار نوکرۍ د فارغ کېدو نه پس بیا په خپل کلي ککشي خېل منډان کښې مستقل پاتے شوے دے۔

دانش د پښتو ادب د هغه لیکوالانو نه یو دے چا چې د پښتو ادب په دواړو مېدانونو یعني نظم او نثر کښې خپلې مېړانې ښکاره کړې دي۔ او خپل نیلے يې زغلولے دے۔ دانش هم د دې اتلانو همسفر دے۔

نو وړومبے راګرځو د دۀ نظم لور ته او ګورو چې په دې مېدان کښې دانش په کوم ډګر وُلاړ دے۔

دانش د نظم په برخه کښې په هر صنف طبع ازمائي کړې ده خو ځینې

داسې اصناف دي چې دانش ورباندې حدکړے دے او د دۀ شخصيت ته يې يو ځانګړے مقام ورکړے دے چې په هغۀ کښې غزل دے ، نظم دے او قطعه که د دۀ د غزل فني جائزه واخلې نو دانش به د غزل د اُستاذانو په قطار کښې درښکاره شي او که د دۀ د غزل فکري جائزه واخلې نو په غزل کښې به يې د لويو لويو فلسفيانو او مفکرينو غوندې لوئے لوئے افکار په نظر درشي۔ لکه په دا غزل کښې د دانش صاحب د لفظونو جادو، د خيال ارفعيت او فني تجربه د غېر منقوط صنعت په صورت کښې جوته ښکاري:

دمه لاړله، دم لاړو، همدم لاړو
روح هم لاړو، د همدم سره سم لاړو

دردِ دل د حوا روح، د آدم روح دے
که دا لاړو، حوا لاړه آدم لاړو

وهم لا د کور وګړو سره مل دے
هم که مار له کوره لاړو لړم لاړو

د مُلا د کرکه کرکه دل د لاسه
اوده لاړه، درود لاړلو، دم لاړو

له ډګر اهلِ ډګر محروم محموده!
رحم لاړو له ډګره کرم لاړو

د نظم په مېدان کښې هم دانش يو نامورے شخصيت دے۔ د پښتون معاشرې بېل بېل موضوعات يې د نظم په صنف کښې چېړلي دي۔ او د لفظونو مصورۍ سره يې اولس ته وړاندې کړي دي۔ د دۀ په مشهورو نظمونو کښې ''بنګړي''، ''د حوا لوُر ته خطاب''، ''عالمي ضمير ته''، ''مسافر ته خط''، ''نوے رنګ''، ''تۀ او زۀ او يوويشتمه صدرۍ''، ''نشۀ جانان''، ''ځامنګي ته''،

''د یو پردېسي ارمان'' او داسې نور نظمونه شامل دي۔ دې نه پرته يې دوه نور طويل نظمونه ''حی علی الصلوة'' او ''حی علی الفلاح'' په نوم ليکلي دي۔ ''حی علی الصلوة'' نظم يې په نمونځ باندې ليکلے دے چې د نمونځ حقيقت، اهميت او مفهوم يې په کښې په ګوته کړي دي۔ او د شعرونو شمېره يې ۲۲۲۲ ده۔ چې د چاپ مرحلې نه تېر دے او په کتابي شکل کښې د ''حی علی الصلوة'' په نوم موجود دے۔ بل طويل نظم د ''حی علی الفلاح'' په نوم ليکلے دے۔ په دې نظم کښې يې د الله جله جلاله د يو کم سل نومونه چې اسماءالحسنٰی ورته وئيلے شي۔ د الله پاک ټول واړه نومونه يې په نظم کښې داسې بيان کړي دي چې د هر نوم يې په يوۀ نظم کښې تشريح کړې ده۔ بلکه دا سل نومونه سل نظمونه دي۔ او د ''حی علی الفلاح'' د نظم په وضاحت کښې يې دا جُمله ليکلې ده۔

''د اَسماءُالحُسنٰی د منظوم تفسير په رڼا کښې د فلاحي رياست ديني تصور''۔

د دې نظم د شعرونو شمېره ۳۳۷۰ پورې ده۔ د دانش که نظم ګورئ او که غزل يو په بل باندې تېر راتېر دي۔ په غزل او نظم کښې د خوږو او ښکليو لفظونو په راوړلو او په مصورۍ کښې شاعرانه رنګونه کارُولو په وجه ځينې ليکوالان ورته د لفظونو مصور او د رنګونو شاعر نوم ورکوي۔

د دانش د خوښې دريم صنف قطعه ده۔ د يوې اندازې مطابق دانش د ۱۲۵۰ نه زياتې قطعې ليکلې دي خو لا د چاپ په انتظار دي په قطعاتو کښې د دۀ صحافتي اپروچ په نظر راځي اکثر قطعې يې حسبِ حال دي يو څو مثالونه يې لاندې کتلے شو۔

''د مقابلې ټوپک''

زۀ د خپل دُښمن نه په يوه کښې هم کم نۀ يمه
ما يې هر هتيار د مقابلې راسره ايښے دے
زۀ د خپل دُښمن د مقابلې ټوپک لرمه خو
ماته يې ټوپک زما د ورور په اوږه ايښے دے

"ژنده مینه"
د چا په مینه کښې ډوبېږه مه چې مینه کوې
عقل مې ډېر درته دا ویر وُکړو خو ویر نۀ ویني
اوس به خامې د تصویر څۀ ویني زړکیه! اوس خو
تصویر ته دومره ورنزدې یې چې تصویر نۀ ویني

"جوړ"
دا ځل دې داسې زړۀ رامات دے چې ټکړي ټکړې دے
د جوړېدلو خو په خدائے که یوه ټکړه وي په کښې
ټکړې ټکړې زړۀ مې په زور زور جوړوم اخته یم
کېدے شي جوړ شي خو دا جوړ به همېشه وي په کښې

"سیرت او صورت"
سیرت یې سوا کړے دے صورت ښکلے لیدۀ شي
زما جانان د ښکلیو په نسبت ښکلے لیدۀ شي
منم چې جنتیان به د سپورمۍ په شان ځلېږي
منم خو په جانان به مې جنت ښکلے لیدۀ شي

"نوے خبر"
په خبرنامه کښې مې نوے خبر واوریدلو
وښل یې چې لاړل په مریخ کښې زندګي لټوي
او لاړل هغه خونخوارۀ درندګان د زمکې
چې زندګۍ له جوازونه د مرګي لټوي

"مصور ته"
یا مصوره! یو وړوکے غوندې کار خو وُکه
زما د وران وېجاړ ګُلشن څو تصویرونه جوړ که
د ګُل پرورو په لاسونو کښې مات شوي ازغي
د ګُل چینانو په لاسونو کښې ګلونه جوړ که

"بې رنګه ښۀ يم "

نۀ خو مې د سپين نۀ د رنګين سره
نۀ مې تحفظ وُشو د خر سره
څنګه به مې چرګې شي د يوې نه دوې
سپي مې چې ملاؤ دي د ګيدړ سره

"د نړيوال کلي ملک "

د نړيوال کلي ملکه! تجربه مې وُشوه
زما د کور مشر چې کله درغلے تاته
زما د کور امن تباه دے زه چې کوم خوا ګورم
لاشونه وينمه، چاؤدنې آورم هرې خواته

بله مينه""

زما خو خيال وۀ چې يوه ستا مينه ده نشته بله
خو ستا د تلو نه پس مې بله مينه وُمنله
اجتماعي مينه چې تا په لته وُوهله
انفرادي مينه زما د زړۀ نه وُوتله

دا او داسې ټولې قطعې دي چې د ژوند په هر اړخ يې ليکلې دي او خلق ورته درنه شاعري وائي نۀ پوهېږم چې سکندر خان سکندر صاحب شعريت څۀ ته وائي کوم چې د دانش په قطعاتو کښې ورته نۀ ښکاري، غواړو چې په دا هم پوهه وُلرو۔

دانش د شاعرۍ دوه کتابونه د چاپ مرحلې نه تېر شوي دي۔ خو د دې نه مخکښې يې يو ځانګړے کتاب د منظومې ترجمې په ۲۰۰۸ء کښې چاپ شوے دے۔ دا کتاب د بنو سره تعلق لرونکي د اردو ژبې يو منلے شوے نوم د مقبول عامر مرحوم د اردو شاعرۍ د "دیئے کی آنکھ" په نوم کوم چې په ۱۹۹۰ء کښې چاپ شوے وۀ دانش د غزل ترجمه په غزل کښې او د نظم ترجمه د نظم په صورت کړې ده کومه چې يوه کامیابه ترجمه وُګرځېده او د اباسين آرټس کونسل پېښور

نه يې پرې ’’مولانا عبدالقادر ايوارډ ۲۰۰۹ء‘‘ وُګټلو۔

د دانش د شاعرۍ وړومبے او په ترتيب دويم کتاب يو طويل نظم دے چې د ’’حی علی الصلوۃ‘‘ په نوم په کال ۲۰۱۹ء کښې د دارلشعور لاهور نه چاپ دے۔ په دې کتاب يې دوه ايوارډونه ګټلي دي۔ يو ’’رحمان بابا ادبي ايوارډ‘‘ او دويم ’’ملاکنډ ادبي ايوارډ‘‘۔

د دانش د شاعرۍ دويم ولې په ترتيب کښې څلورم کتاب د ’’کاش چې زۀ هم صحابي وے‘‘ په نوم د نعتونو مجموعه ده ، کومه چې په کال ۲۰۲۱ء کښې د اعراف پرنټرز پېښور نه چاپ ده چې د وزارتِ مذهبي اُمُور پاکستان له خوا يې ’’قومي سيرت ايوارډ‘‘ ګټلے دے۔

د دې نه پرته د دانش نوره شاعري چې څو کتابونه ترېنه برابرېږي۔ لا د چاپ په انتظار کښې دي، چې په کښې غزل، نظمونه، رباعيانې، قطعې او نور اصناف شامل دي۔

په فني او فکري توګه دانش په هر دور کښې يوه نوې نمونه وړاندې کړې ده۔ ماشاءاللہ! نن بيا د ادب مېدان ته د داسې نوې تجربې سره راوتلے دے چې د پښتو په تاريخ کښې يې مثال نۀ شته او هغه دا چې د صنعتِ غېرمنقوطه په چوکاټ کښې يې نۀ يواځې غزل ليکلے دے بلکه د سلو نه زياتو غزلو مجموعه يې د "درد دل" په نوم چاپ شوه ، زر ده چې مينه وال به يې پرې خپلې فني او فکري دواړه تندې ماتې کړي۔ د دانش اکثر نظمونه او غزل زياتو سندرغاړو په خپلو خوږو آوازونو زمزمه کړي دي لکه : ماه جبين قزلباش، رسول بادشاه ، احمد فراز، سردارعلي او شاه زېب خان او داسې نور۔

د پښتو ادب د نثر په مېدان کښې هم دانش خپله مېړانه ښکاره کړې ده۔ د بنو د سيمې نوموړے ليکوال ، بابائے سندره غازي سيال په ژوند او ادبي خدماتو باندې يو زبردست تحقيقي کتاب د ’’غازي سيال ژوند او ادبي خدمات‘‘ په نوم ليکلے دے چې په دوو ايوارډونو نمانځلے شوے دے۔ ۱۔ ’’ملاکنډ ادبي ايوارډ‘‘ او ۲۔ ’’پاکستان رائټرز ګلډ ادبي ايوارډ‘‘ او هم دغه کتاب د چاپ مرحلې نه تېر شوے دے۔

دغه رنګ د ''ایشیوروني څۀ پرېښي نۀ دي'' په نوم يې د ۵۰۰۰ نه زيات د بنوڅی لهجې متلونه يې سره د اردو ترجمې راغونډ کړي دي۔ چې لا چاپ نۀ دي خو د چاپ مرحلې ته نزدې دي۔ د تصوف په پېچلې موضوع يې هم ليکنې کړې دي چې دغه مقاله هم د چاپ په انتظار پراته ده۔ د شمالي وزيرستان سره تعلق لرونکے ليکوال خدائے بخښلے لائق شاه درپه خېل ''تاريخِ وزيرستان'' يې هم اردو ژبې ته ترجمه کړے دے ۔ چې دا هم د چاپ په انتظار پروت دے ۔

د يو محقق او نقاد په حېثيت يې د ډېرو ليکوالانو په کتابونو مقدمې ليکلې دي۔ په ډېرو رسالو او مجلو کښې يې په مختلفو موضوعاتو باندې مضمونونه او مقالې چاپ دي ۔ افسانې او شاهکارې ډرامې يې ليکلې دي ۔ چې ځينې ډرامې يې په ژوندۍ بڼه سټېج شوې هم دي لکه:

''د شعور مدرسه''، ''نړيوال کلے''، ''ګړګتائ'' او داسې نور ---------

د دې نه پرته دانش د خېبر پختونخوا په مختلفو سېمينارونو، ادبي ټولنو او نورو ادبي هلو ځلو کښې ګډون کړے دے او کوي يې ۔ ماشاءالله لا ځوان دے او ادبي ذوق يې لا په مستۍ کښې دے۔ اُميد دے چې يو وخت به دې ته چمتوُ شي چې پاتې ناچاپي اثار به يې د ادب مېدان ته راشي او د علم او پوهې نه ډکې نورې ليکنې به يې د قام د بچو په لاسونو کښې د استفادې په خاطر وُنازوُلے شي۔

ربِ ذوالجلال نه دُعا ده چې د نورو ټولو ليکوالانو سره ژوند او صحت ورکړي۔ ''آمين''۔

زۀ پوهېږم چې د دانش په شخصيت او ادبي خدماتو کښې زمانه ډېر څۀ پاتې شول خو دا به بيا شي خبره د دانش صاحب په دې شعر راغونډوم چې:

تا پسې چې تلے يم نو تلے يم
بيا راغلے نۀ يمه چې څۀ شومه

منال امین

ډاکټر اباسین یوسفزے

ډاکټر اباسین یوسفزے د پښتو مشهور شاعر، ریسرچ سکالر، او لیکوال دي. ډاکټر صاحب د کوز دیر په کلي خان پور کښې په ۱۹٦٤ کښې زیګېدلی وۀ. هغوي د پښور پوهنتون نه په ۱۹٦۸ کښې ل-ل-بي وکړه او په پښتو ژبه کښې په ۱۹۸۸ کښې د شپاړسم سند واخستو۔ هغوي په پښتو ژبه کښې خپله پي ایچ ډي په کال ۲۰۱۸ کښې پاې ته ورسوله . ډاکټر صاحب د پښتو او د اردو ژبو د لسو نه د ډېرو کتابونو لیکوال دی.

هغوي ته څلور سوه انعامونه او تمغې مېلاو شوي دي. اباسین یوسفزی ته د پښتو ژبې د لیکنې په مرسته په کال ۲۰۱۸ کښې د افغانستان صدارتي انعام او په کال ۲۰۲۰ کښې د پاکستان صدارتي انعام مېلاو شو.ډاکټر صاحب د تېر ٤٥ کالو نه د پښتو ژبې لیکنې، پښتو او اردو اخبارونو ، مېګزین، ریډیو او ټي وي سره تعلق لري.د خپل کرشماتي شخصیت د وجې ډاکټر صاحب په غونډ پاکستان کښې د پښتو او اردو د ډېرو غونډو حصه پاتې شوی دی.ډاکټر اباسین یوسفزی ته د اسلامیه کالج پوهنتون د ټیچنګ سټاف اسوسي اېشن له طرفه د غوره شوونکی انعام ورکړې شو.

اباسین او شاعري

ډاکټر صاحب وایي چې هغوي د وروکوالي نه د کتابونو او رسالو لوستلو شوق لرلو. د هغوي پلار ډېر ادب زوقه سړی وۀ. د ډاکټر صاحب د پلار په خپل کور کښې یو کتابتون وۀ چې ډاکټر صاخب په ډېر کم عمر کښې لوستلې وه.

ډاکټر صاحب وايي چې د اسکول د وخت نه به په روژه ګنبې هغوي ټوله شپه کتابونه لوستو او د هغوي ادبي ذوق او فکر فراختيا موندله. هغوي وايي چې کله هغوي اسلاميه کالج کنبې داخله وکړه نو هغوي ته د اظهار موقع په لاس ورغله او هغوي په مقابلو کنبې حصه اخستل شورع کړل کوم کنبې چې به ډاکټر صاحب هر ځل له ګټله. ډاکټر اباسين يوسفزی وايي چې شاعري د هغوي محبوبه ده. هغوي وايي چې د شاعری نه بغېر زه نيمګړی يم. ډاکټر صاحب وايي چې ما عام اولس په شاعری پېژني او شاعري ماته د زړه سپکولو موقع راکوي. هغوي وايي چې د کومو خبرو تذکره زه په عام خبرو کنبې نه شم کولی هغه زه د شاعری په زريعه کوم.

هسې خو ډاکټر اباسين يوسفزی د ژوند په څو موضوعاتو ليکل کړي خو د هغه نظم ليونی کېږم د خلکو ټولنه او په هر هغه څه کې بدلونونه چې د ذهنونو د جنون لامل کيږي چې انسان په دې ليونی کيږي.

انګرېزی کنبې ترجمه

I am going to be mad
Abaseen Yousafzai

I'm astonished to see misdeeds of justice
I'm afraid of the philosophers of law
I'm scared as a jackal of the image of time
I'm frightened of my own beautiful pictures
I'm sold for nothing in the market of wisdom
In such a situation, 0, pals! Would I not be mad
For what reason we have been put in the prison
Come on my friends! Let's all be mad together

The man is bragging at the dump of gunpowder
The smoke of charred flesh is rising around the world

The prophet of peace are forced to starve and perish
Awards are distributed among the makers of bombs
Immeasurable apathy prevails, and the good is destroyed
How could the thirst be quenched with poison
For how many years the helpless Japanese were burning
Come on, my friends! Let's all be mad together

Judgment between the good and bad has gone by
We search ourselves in the dazzling light of the gold
No effect has remained in the prayer of anyone
In whom I should look for virtues of our saints
Values are buried, and thinking floats in space
Nothing has remained to be called grace and dignity
Solomon's collyrium has been applied to every eye
Come on, my friends! Let's all be mad together

The student tears the collar of teacher
The blood of a student stains the apron of the teacher
There were charmers of snakes and scorpions
But) there is no treatment for the poisonous man(
The healers are patients themselves but of money
The patients now treat the patients
We want now return to fourteen hundred years back
Come on my friends! Let's all be mad together

Do you hear the shouting of the fair-brokers
See the open throats of the big-mouth serpent
Listen to the shrieks of beautiful, rosy children
What should we think of the progress of science
We have lost track of our forefathers
Abettors of thieves! O, the watchmen of the world
The love and affection have gone up to Heaven

Come on, my friends! Let's all get mad together

The chastity of damsels is abused here and there
The man runs naked after the bread; what a pity
With a golden necklace around the neck, he is the slave
He himself has become the prey, hunter, and snare
How many times he was blamed for his own humanism
Love is pruned, and hatred flourishes instead
Let us have epileptic fits and be real psychic
Come on, my friends! Let's all be mad together

Those who are busy day and night in hard labour
Are poor, astonishingly, in every country
The blessed ones are worried about digestion
And the cursed ones are waiting in tents for the bread
The wicked have stores and reserves in abundance
The noble and respectable are as lean as the dog-tail
Why the thinking of people has become so much devilish
Come on, my friends! Let's all be mad together

I want beautiful shades all around the world
Until that time, I will pray you incessantly
Though a man, I bite a man like a dog
I can't endure this worn-out life any longer
I pack up my home before the flood of blood arrives
I groan like an animal due to pangs of severe pain
My nature, amidst animals, has become animalistic
Come on, my friends! Let's all be mad together

The demon of time scares me, it must be said
I'm out of patience but can't weep, it must be said
All the virtues must be called vile and vice

The darkness around must be called light
In this century, nothing else but lie must be told
But my conscience directs me to tell the truth
No matter if we suffer extremely for the truth
Come on my friends! Let's all be mad together

❁ ❁ ❁

بلوچی

عبدالحلیم عالم

شاہ آباد

شپءِ ساهت یک اِنت ءُ من لیاریءَ وتی لوگءِ دیمءِ مسیتءِ دیم په دیمءِ دوکانءِ دپءَ اوشتاتگ آں۔ لئین نیست۔من سگریٹے روک کتگ ءُ ماہ ءَ چارگءَ آں۔سگریٹءِ سُھریءَ اگاں چه دورءَ کسے به گِند اِیت داں زانت که من سگریٹ کشّگءَ آں بلے ماہءِ رُژنائیءَ چه هرکس بے سما اِنت۔ شاہ آبادءَ ماہءِ باز نام اَنت ءُ همُک شپءَ آئیءَ دگه نامے دیاں۔

مارا شش ماہ بیت که لیاریءَ آتکگ اِیں بلے من لیاری انگتءَ سرجمءَ نه دیستگ۔ لیاریءِ مردُم هم مئے وتیگ اَنت بلے من تهنا آں۔ مئے لوگ کلڑیءَ اِنت ءُ لوگانی دیمءِ دگّ یک نیمگے دیم په چاکی واڈاءِ نیمگءَ رئوت که آئوده بیگاه آں من کوئٹه ہوٹلءَ چاہءِ ورگءَ رواں بلے آئوده مُچّی، رکشه آنی گیرّ ءُ گار، زهگانی کوکار منءَ زوت بےزاری کن اَنت۔ دومی نیمگءَ لوگانی کشءِ نیمگءِ دگّ کهارادرءِ نیمگءَ درکئیت۔ من گیشتر شپءِ ساهت دوازدهءَ رند همے نیمگءَ سرے جناں۔ اِدءَ کهّ دگّ پراہ ءُ شاهگان تِر اِنت، جاگه ساپ تِر اِنت ءُ اے وهدءَ هاموشی اِنت۔هاموشیءَ من وتی اندرءِ توارءَ گیشتر اِش کت کناں۔

لیاریءِ آهگءَ چه پیسر ما شاہ آبادءَ بوتگ اِیں۔ شاہ آباد هر رنگءَ جُتا اِنت۔ شاہ آبادءِ دمک، شیپءُ کئور، مچکدگ، ڈنّ ءُ در منءَ پجّا کار اَنت۔ آئوده چه ساہ زورگءَ پد منءَ لیاریءِ دمکانی ترّ ءُ گرد نپس گیر کن اَنت۔ شاہ آبادءَ چه گیشتر شاہ آبادءِ دل مزن اِنت۔ شاہ آبادءِ هاکءَ من رُستگاں ءُ ماتیءَ لیلو جتگ ءُ شاہ آباد نازینتگ۔ منی پیرُکءَ نام گِپتگ اَت که آ وهدے شاہ آبادءَ آتکگ ، گُڑا اِدءَ هِچ لوگ نه بوتگ۔ منی پیرُکءِ نام دادشاہ بوتگ پمیشکه مردُماں اِیشیءِ نام

شاہ آباد پِر کتگ۔ شاہ آبادءَ مئے لوگ میانءَ اِنت۔ پُشتی نیمگءَ کِشک کوہ آں رئوت دیمءِ نیمگءَ مچکدگ اِنت۔ چپیں نیمگءَ سپاہیانی کیمپ اِنت ءُ راستیں نیمگءَ مسیتے۔ وھدے شاہ آبادءَ سپاہی ماراِتک اَنت گُڑا ما لڈ ءُ بوج کُت لیاریءَ آتک اِیں۔

انّو اِدءِ دوکانءِ دپءِ آھگءَ چہ پیسر من کھارادرءَ روگءَ اِت آں۔ رکشہ اسٹاپ گُوازینت داں اولی رندءَ من چار بے پجّاریں تُپنگی دیست۔ دگّءِ سرا اوشتاتگ اِت اَنت۔ من لوٹ اِت کمار اِش مہ کن آں ءُ راستیں دمکءَ چہ پِر بہ ترّآں داں یکّءَ منءَ توار جت۔چو سپائی آں جُست ءُ پُرسے بندات کت، پٹءُ لوڑ کت۔ پدا یکّءَ دومیءَ را گُشت کہ "اے دگرے"

منءَ روگءِ اشاریے دات۔ وھدے کہ من راہ گِپت آں منی نِزّءَ شاہ آباد اِنت ءُ ھر جاگہءَ سپائی آں تُپنگ دستءَ اَنت ءُ اوشتاتگ اَنت۔

آ شاہ آبادءِ یک گُڈّی شپے اَت۔ یات نہ کنت منی دل آں دہ جون اَت۔ من مسیتءِ دیوالءِ لمبءَ اوشتاتگ اِت آں۔شپ گرم اَت۔ تھاری نوکی بیمناک بوان اَت۔ لئین ھم نیست اَت۔ ھاموشی ءُ تھنائی منی ھمراہ اِت اَنت۔ تُرس کمّو ھست اَت۔ اناگہءَ گاڈیانی آواز اَت، لیٹ سک بوت اَنت داں دیست سپائی پرپٹءِ رندا کپتگ اَنت۔ منی نزوکءَ اوشتات اَنت۔ تیرانی توارءِ میانءَ یک اُپّءِ توار اَت کہ گیمُرت۔ دگّءِ سرا کپتگیں جون ایوک اَت کہ کسےءِ گُڈّی ساہ اَت۔ ایشیءَ چہ رند ما لیاریءَ آتک اِنت۔

مرچی ھم من مسیتےءِ دیمءَ اوشتاتگ آں۔ لئین نیست۔ سگریٹ روک اِنت ءُ ھمے جیڑگءَ آں سپائی ءُ بے پجّارانی تُپنگانی میانءِ تپاوت چے اِنت پدا ماہ زاھر بیت ءُ پدا من شاہ آبادءِ ماھکانیءِ ٹرانگءَ کپ آں۔

دلگوش: ایشیءَ من اردوءَ نبشتہ کنگءَ آں اے درونت رجانک کتگ

سندھی

ندیم

بيت

سنڌين جون محبتون نماڻيون ادا
ڪڌهن ڪون ٿينديون پراڻيون ادا

ونڻ ڇا ٿئي ٿو اسين ڏيڻ ڇاڻون
باقي سپ ڪوڙيون ڪهاڻيون ادا

ڇڪاچوند شهرن جي وٽي ٿي ڇو
گهمي ڏس سنڌ جون ٻهراڙيون ادا

❁❁❁

لائبہ فاطمہ

وتايو فقير

دوستو فقير سنڌ سان تيلق رکندڙ اهو ڏاهو، فقير ۽ الله لوڪ ماڻهو هو جيڪو سنڌ ۾ ٿہ دانائي جي پوڳ چرچن جي ڪري مشهور ٿہ ٿيو ئي ٿيو آهي پر وقت گزرڻ سان گڏو گڏ هن جي دانائي جا قصا سنڌ سان گڏو گڏ پرڌيھ ۾ بہ مشهور ٿيا آهن. جيئن شيخ چلي پنهنجي چرچن جي ڪري تمام گهڻو مشهور آهي تيئن ئي سنڌ ۾ وتايو فقير پنهنجي قصن، ڳالهين ۽ واقعن جي ڪري تمام گهڻو مشهور پڻ آهي.

وتائي فقير بابت هونئن ته گهڻيون ئي روايتون آهن پر جيڪا معلومات مستند لڳي ٿي اها هن ريت آهي ته هو نصرپور جي لڳ هڪ ڳوٺ ۾ پيدا ٿيو جيڪو ٽنڈو الله يار جي ويجهو آهي، جو واهڻائي واڻيو هو، ننڍپڻ کان پنهنجي سوچ سمجھ سادي سودي هيس، اڪثر پنهنجي سڃاڻ ۽ پنهنجي مالڪ جي سڃاڻ ۾ محو رهندو هو. زندگي جي ڪنهن موڑ تي پهنجو ڏرم ڇڏي دين ڏانهن لاڙو رکيائين، پهرين پاڻ ۽ پوءِ سڄو گهراڻو شيخ ٿيو. سندس قبر ۽ درگاھ ٽنڈي الهيار ۾ سان ڦُبي اسٽاپ لڳ آهي.

ڪن جو هي به چوڻ آهي ته وتايو فقير پنهنجي وقت جو سياڻو ماڻهو هو، بلڪه ڪي ته ايئن به چوندا آهن ته سياڻي سنڌ سياڻو ماڻهو هڪ ئي پيدا ڪيو اهو هو وتايو. ڏاها ڏيھ ۾ گهڻا پر سياڻو لکن ۾ هڪڙو. ڏاهي جي ڏاهپ جو دارومدار آهي ڏاھ تي، يعني ٻڌ سڌ يا خبرچار تي، پر سياڻو ماڻهو ان کي چون جنهن کي اندر جو سوجهرو هجي ۽ سڃاڻ هجي. ان ڏس ۾ ڄمندي ڄام هو. وتايو فقير سر بچاءُ ۾ چريو ٿي عمر گذاريائين. ايئن به هرو ڀرو صحيح نه هو جيئن چيو ٿي ويو ته ڪا ڪل ٽڙي هيس يا متيون ڏيندي لوڪ کي چريو پاڻ ٿيو هو، بلڪل نه وتايو هرگز اهڙو اياڻو نه هو، البت چريائي جي اوٺ ۾ ہين کي متيون ڏيندو هو.

وتائي فقير جي حوالي سان ڪجهه روايتن ۾ اهو به ڄاڻايل آهي ته وتائي جي پيءُ جو نالو ميلهورام هو ۽ سندس اصل نالو وتڻ مل هو، جو پوءِ وتو مل سڏجڻ ۾ آيو. ساڳئي سمي عمرڪوٽ ويجهو مهراڻي درياهه تي رنگريز ۽ ڪنڀاڻين جا ڪيترائي پاڙا رهندا هئا. جن سان ميلهورام پڻ ڪنڀاڻي هئڻ ڪري گڏجي ڪم ڪندو هو. اُهي بگ، چُنيون، پيٺيون، اَجرڪون، دمچيون ۽ پڙا وغيره رڱي وڪڻي گذران ڪندا هئا ۽ اهو سامان مسلمان ئي هنڊائيندا ۽ اوڍيندا هئا. پري پري تائين سندن ڪم جو ناماچار هوندو هو. اوچتو اهڙو ڦيرو آيو جو سندن ڌنڌو ماٺو ٿي ويو. ڌڪار پيو ۽ اوائلي اپت ۾ ڪَتر پوڻ لڳي. پوءِ رڱاوت جو ڪم ڪندڙ کتري ٽڙي پکڙي ويا پر ميلهو رام خيال ڪيو ته اسان ڪاڻ اگهاماڻو شهر بهتر ٿيندو. اتي مسلمان گهڻا ٿا رهن ۽ بندر هئڻ سبب مال جو اُڪلاءُ ٿيندو رهندو. چو ته هتان جو ڏيساور سان واپار هلي ٿو. پوءِ هو ڪٽنب سميت لڏي اگهاماڻي ويو.

وتائي جا ڪجهه مشهور پوڳ

وتايو دنيا جي انهن عظيم هستين مان هڪ هو جيڪي انسان ذات لاءِ هادي ۽ استاد ٿي آيا، جن آدمين کي اخلاص، اخلاق ۽ انسانيت جي سکيا ۽ ساڃاهه ڏني، ماڻهن کي پاڻ ۾ پريت وندڻ ۽ ڌرتيءَ جو ناتو نڀائڻ جو سبق ڏنو. وتايو دنيا جي اهڙن فليسوف ۽ مفڪر انسانن مان هڪ هو، جن پنهنجي سموري عمر قدرت جي اسرار پروڙڻ ۽ سندس ڳجهارتن جي تحقيق ۾ سيڙائي، جيئن انسانيت جي اڳتي هلي ذهني سڌار ۽ سنوار ٿي سگهي. وقت جي انهن آڪاڻين پٺيان ڏاهپ ۽ سياڻپ جا نڪتا سمايل آهن، جن مان ڪجهه هيٺ ڏجن ٿا:

وتائي وارو اڳ وڻڻ

هڪ ڏينهن ماڻهن کي هي ڏسي حيرت ٿي ته صبح سويل کان وتايو مقام جي لنگهه تي ڌرڻو ماري ويٺو رهيو ۽ مقام ڏانهن ايندڙ جنازن جي پچا پئي ڪيائين، ڪن ماڻهن ڪانئس پڇيو ته وتايا! خير ته آهي فجر کان مقام جو در ورتو اٿئي؟ وراڻي ڏنائين ته رات ڪو شاهينگ جُتي تڳائي ويو آهي ۽ چور جي اڳ وڻڻ لاءِ هت ويٺو آهيان، اڳي پوءِ ايندو ضرور هتي، ويندو ڪيڏانهن؟

دوزخ ۾ باهه ڪٿي؟

هڪ ڏينهن وتائي پنهنجي امڙکي چيو ته ”امڙ بک لڳي اٿم، ماني

ڪارائين ته چڱو!“ تنهن تي ماڻس وراڻيس ته ابا گهر ۾ باهه ڪونهي ڪٿان پاڙي مان ٽاندو ڪڍي اچين ته ماني پچائي ڏيان. وتايو اوڙو پاڙو گهمي آيو پر ڪٿان به ٽاندو ڪونه مليس ۽ ماءُ کي چيائين ته امان وڃان ٿو دوزخ مان باهه ڪڍڻ. جهٽ پلڪ بعد ڪلندو ٽپا ڏيندو گهر ڏانهن موٽيو ۽ ماءُ پڇين ته ابا ٽاندو مليو؟ جواب ڏنائين ته: ”امڙنه، دوزخ ويس ته اتي وارا فرشتا مونتي کلڻ لڳا ته هتي باهه ڪٿي، الله پاڪ ڪو بٺيءَ وارو يا نانوائي ته نه آهي جو باهه جا ڪورا يا بٺا ٻاري ويهي پنهنجي مخلوق کي شيخ ڪباب جيان پچائي، هتي هر ڪو پنهنجي آڳ جي ڪوٽا پاڻ سان گڏ کنيو ايندو آهي، جا باهه هر انسان لوڀ، لالچ، حسد، بغض، ۽ نفرت جي روپ ۾ پاڻ وٽ جمع ڪندو ٿو رهي، هتي اچي هر ماڻهو پنهنجي گڏ ڪيل باهه جي پونجي ۾ پاڻ پچرندو ٿو رهي.

مهماني ڪپڙن جي!

هڪ دفعي وتايو وچي شهر جي هڪ وڏي دعوت ۾ شريڪ ٿيو، جتي ماڻهن ويٺي خيرات ڪاڍي، سندس ڦاٽل پراڻا ڪپڙا ڏسي ماڻهن ڪيس لوڏي ڪڍيو. وتايو گهران پنهنجي ياءُ جا نوان ڪپڙا پيتي مان ڪڍي پائي وري ساڳي دعوت ۾ اچي شامل ٿيو. ماڻهن سمجهيو ته ڪو معزز مهمان وارد ٿيو آهي، هڪدم سندس هٿ ڌوئاري، دسترخوان وڇائي، ٻوڙ پلاءُ آڻي آڏو رکيائونس. بجاءِ طعام نوش ڪرڻ جي وتايو ٻوڙ پلاءُ جا چمچا پري پنهنجن ڪپڙن مٿان هاريندو رهيو ۽ ڪپڙن کي مخاطب ٿي چوندو رهيو ته ”هي مهماني اوهان جي آهي، کائو ۽ خوب کائو، مونکي ته اڳ ۾ لتون هڻي ٻاهر اماڻيو هئائون.“